آپ بیتی : پروفیسر آلِ احمد سُرور

# حرفِ سُرور

ترتیب و تشکیل :

زہرا معین

# حرفِ سُرور

E Books
WHATSAPP GROUP

پروفیسر آلِ احمد سُرور کی اُنہترویں سالگرہ کی مناسبت سے

E Books
WHATSAPP GROUP

مکتبۂ عالیہ — ایبک روڈ (انار کلی) — لاہور

طبع اول :

ناشر : الطاف حسین

مطبع : منظور پریس۔ لاہور

قیمت : ۲۱/۰ روپے

# حرفِ سُرور

آپ بیتی :

پروفیسر آلِ احمد سُرور

E Books

WHATSAPP GROUP

ترتیب و تشکیل :

زہرا مُعین

آپ ہمارے کتابی سلسلے کا حصہ بن سکتے
ہیں مزید اس طرح کی شان دار،
مفید اور نایاب کتب کے حصول کے لئے
ہمارے وٹس ایپ گروپ کو جوائن کریں

ایڈمن پینل

عبداللہ عتیق : 03478848884
سدرہ طاہر : 03340120123
حسنین سیالوی : 03056406067

مکتبۂ عالیہ - لاہور

Hasnain Sialvi

زہرا معین
ایم اے

E Books
WHATSAPP GROUP

موجودہ مصروفیت :

اسسٹنٹ پروفیسر و صدر شعبۂ اُردو
گورنمنٹ کالج برائے خواتین، فیصل آباد

مطبوعات و مرتبات :

۱۔ باغ و بہار کا تنقیدی اور کرداری مطالعہ، ۱۹۷۳ء
۲۔ عرفانِ اقبال (آلِ احمد سرور)، ۱۹۷۷ء
۳۔ حرفِ سرور (آپ بیتی آلِ احمد سرور)، ۱۹۸۰ء

Hasnain Sialvi

# ابواب:


○ عرضِ مرتب : زہرا معین صفحہ ۹

۱۔ میرا سفرِ حیات ۱۷

۲۔ بچپن کے اثرات اور تعلیم ۲۵

۳۔ آگرہ میں چار برس : کالج کا دور ۳۱

۴۔ علی گڑھ میں ورود ۳۹

۵۔ معلمی کا آغاز اور اعزاز ۴۷

۶۔ دس برس علی گڑھ سے دُور ۵۵

۷۔ کچھ اہم واقعات ۶۱

۸۔ میری پسندیدہ کہانیاں ۶۹


E Books
WHATSAPP GROUP

| | | |
|---|---|---|
| ۹- | میری شاعری | ۸۱ |
| ۱۰- | تنقید کے بارے میں میرے تصورات | ۹۵ |
| ۱۱- | تنقیدی مسائل | ۱۳۵ |
| ۱۲- | اُردو میں ادبی تنقید کی صورتِ حال | ۱۵۳ |
| ۱۳- | میرا تنقیدی اور ادبی نقطۂ نظر | ۱۷۷ |
| ۱۴- | بطور نقاد مجھ سے کچھ سوال | ۱۸۹ |
| ۱۵- | میری کچھ تنقیدی تصنیفات | ۲۰۱ |
| ۱۶- | کچھ دن پاکستان میں | ۲۱۱ |
| ۱۹- | آرزوئیں اور ارادے | ۲۲۵ |
| ○ | کتابیات : | ۲۳۱ |



E Books
WHATSAPP GROUP

مُعین صاحب کے نام

دل میں مُسوّدے تھے بہت، پر حضورِ یار
نکلا نہ ایک حرف بھی میری زبان سے

——— میر

مجھے ہر کیفیت میں کیوں نہ سمجھے
وہ میرے سب حوالے جانتا ہے

——— پروین شاکر

ز مُعین

E Books
WHATSAPP GROUP

E Books
WHATSAPP GROUP

"میں معین صاحب کو اپنے ہی خاندان کا ایک فرد سمجھتا ہوں"

—— آلِ احمد سرور

علی گڑھ، ۱۶ جنوری ۱۹۷۸ء

○

Hasnain Sialvi

# عرضِ مرتّب

زہرا معین

پروفیسر آلِ احمد سرور، اُن گنی چُنی شخصیات میں سے ہیں جن کے بعض خیالات سے پورا اتفاق نہ کرتے ہوئے بھی، طالب علمی کے زمانے ہی سے جن کا مجھ پر بہت اثر رہا ہے:

" وہ سایہ دار شجر
جو مجھ سے دور بہت دور ہے، مگر اس کی
لطیف چھاؤں
سجل نرم چاندنی کی طرح
مرے وجود، مری شخصیت پہ چھائی ہے!"

لیکن اس میں سرور صاحب کی بڑائی کیا ہوئی؟ یہ تو اپنی خوش مذاقی یا خود توصیفی کا اظہار یا اشتہار ہوا۔ بہرحال — اقبال کے صد سالہ جشن ولادت کے موقع پر ۱۹۷۷ء میں مجھے اقبال سے متعلق سرور صاحب کے بکھرے ہوئے مقالات کو "عرفانِ اقبال" کے نام سے مرتب کرنے کا موقع ملا۔ اقبال پر اپنے مستقل مقالات سے قطع نظر، سرور صاحب نے شعر و ادب اور اکابر شعر و ادب پر اظہار خیال کرتے ہوئے جہاں تہاں اپنی دوسری تنقیدی تحریروں میں بھی ضمناً اقبال کے بارے میں بڑی فکر انگیز اور خیال افروز باتیں کہی ہیں۔ اس احساس کے پیشِ نظر میں نے اقبالیات پر سرور صاحب کے متفرق تنقیدی اشارات کی جمع و ترتیب کے خیال سے سرور صاحب کی ساری دستیاب نگارشات کی چھان پھٹک شروع کی۔[1]

جلد ہی سرور صاحب کی تحریروں کے مطالعے کی یہ محدود اور بالضرورت مہم معین صاحب کے سمجھانے پر وسیع تر تناظر میں خود سرور صاحب کی ذات اور اُن کے میلانات کے مطالعے کی خوشگوار صورت اختیار کر گئی — اور بالآخر پیشِ نظر کتاب کا باعث بنی!

○

---

[1] میری اس کاوش کا حاصل "عرفانِ اقبال" میں محفوظ ہے (صفحہ ۱۶۹ — ۱۴۰)

سرور صاحب کی "یہ" داستان "آپ بیتی" کے لگے بندھے روایتی تصور سے مختلف نوعیت اور طرز کی چیز ہے — اس کے سارے حرف اگرچہ سرور صاحب ہی کے ہیں لیکن ان کی ترتیبِ نو اور ان حروف سے ایک نئے جہان کی تعمیر اور ایک جلوۂ تازہ کی تشکیل کے لیے سرور صاحب کو ماخوذ نہیں کیا جا سکتا۔

حرف معتبر ہیں۔ ان حروف سے جو عکس بنتا اور نقش اُبھرتا ہے، وہ سرور صاحب ہی کا ہے، عکاس بھی وہی ہیں اور نقاش بھی وہ خود — لیکن اس سلسلۂ آیات کی ترتیب و تشکیلِ نو میں کوئی خوبی ہے یا کہیں خلا ہے، سوزن کاری گھٹی ہوئی ہے یا بخیہ موٹا ہو گیا ہے یا پھدرا رہ گیا ہے، جامہ چُست اور چپاں ہے یا اس میں کہیں جھول آ گیا ہے — غرض، قطع و قامت کی زیبائی یا خرابی اور تراش و تراوش کی عمدگی یا ناموزونیت اور بحیثیتِ مجموعی اس "آپ بیتی" کی بُنَت کے حُسن و قبح کا بوجھ تمام تر مرتب کے سر ہے !!

○

سرور صاحب کے نزدیک شخصیت کا حسن ذہانت کی چمک دمک میں نہیں، کردار کی استواری اور مضبوطی میں ہے جو زندہ اور توانا خیالات سے آتی ہے — سُرور صاحب کی شخصیت کے حُسن تک پہنچ پانے اور اُسے گرفت میں لانے کے لیے میں نے یہی راستہ اختیار کیا ہے۔ یعنی : نظر، زیادہ تر اُن کے "خیالات" پر رہی ہے، محض "حالات" پر نہیں !

اِس طرح دیکھیے تو یہ رُوداد ایک بے کیف "شرحِ احوال" کی صورت اختیار کرنے کے بجائے سُرور صاحب کی سیرت و شخصیت کی جاندار مظہر، اور اُن کے افکار و افکار، اُن کے ادبی معتقدات اور تصورات، اور اُن کے میلان یا جھکاؤ کی ایک کیف آور داستان بن گئی ہے۔ یہ صرف مجمل روداد سفر ہی نہیں، ایک محکم اور روشن نقطۂ نظر کی حامل، ادبی دستاویز ہے اور بجائے خود اپنا ایک بھرپور اور دلآویز تشخص رکھتی ہے

بیس بائیس برس پہلے ایک موقع پر سُرور صاحب نے کہا تھا :

"اپنے بارے میں لکھنے کو جی بھی چاہتا ہے، مگر وہ فرصت کہاں سے لاؤں؟ ادھر حال یہ ہے کہ دُنیا بھر کی حماقتوں میں گھرا ہوا ہوں اور ان حماقتوں کو سعادت سمجھنے کی کوششوں میں مصروف — یونیورسٹی میں تدریسی کاموں کے علاوہ انتظامی کام، انجمن کے مسائل، اپنی ریسرچ اور دنیا بھر کی بیگار، غرض جس عالم میں ہوں، میں ہی جانتا ہوں[۱]"

اِس عالم میں سُرور صاحب کی زیرِ نظر "آپ بیتی" کو یہ جتنی اور جیسی کچھ بھی ہے، بسا غنیمت خیال کرنا چاہیئے — میری دلی دُعا ہے کہ دنیا بھر کی جو عافیت سوز حماقتیں اور بیگاریں سُرور صاحب کو گھیرے ہوئے ہیں، ان بیگاروں اور حماقتوں کو خدا اب کوئی اور گھر دکھائے اور سُرور صاحب کو ان سے نجات دلائے کہ وہ اپنے پھیلے ہوئے کاموں کو سمیٹ اور نمٹا سکیں جن میں سے ایک، اپنی روداد حیات لکھنا ہے — جسے لکھنے کو ان کا جی چاہتا بھی ہے !!

اور یا پھر کاش ! محدود پیرائے کی زیرِ نظر کوشش مہمیز کا کام کر جائے اور سُرور صاحب اپنی ایک پُرزور اور بھرپور آپ بیتی "لکھنے کے لیے آمادۂ اظہار یا بیکار ہو جائیں —— ایسا ہوا تو میں اسے اپنا اعزاز اور انعام جانوں گی !!

بفن (Buffon) نے ایک موقع پر کہا ہے کہ :

"To write well is atonce to Think well, to feel sightly and to render properly! it is to have at the same time, mind, soul, taste."

---

[۱] و [۲] شخصیات اور واقعات، ص ۱۶۸-۱۶۹

سُرور صاحب بیک وقت، دل، دماغ اور مذاق کی اعلیٰ اور پاکیزہ صفات اور صلاحیتوں کے ساتھ ایک محکم، متوازن اور توانا شخصیت کہلاتے ہیں۔ شخصیت، جو اپنے اندر بڑا گداز اور بڑی دلآویزی، انفرادیت اور انوکھا پن رکھتی ہے۔ اس لیے مجھے یقین ہے کہ سُرور صاحب کو کشاکشِ غمِ پنہاں سے فرصت ملی اور وہ اپنی "آپ بیتی" کے لیے وقت نکال پائے تو یہ اُردو کے خود نوشت سوانحی ادب کا ایک نیا معیار قرار پائے گی۔

○

زیرِ نظر "آپ بیتی" جس کے ماٰخذ کی تفصیل کتاب کے آخر میں درج ہے، سرور صاحب کی اُنہترویں سالگرہ کے مبارک و مسعود موقع پر شائع ہو رہی ہے۔ خدا اُنھیں سدا سلامت، باکرامت اور شاداب و شادماں رکھے:

" دشتِ ادب میں جس پیڑ نے
گھنی چھاؤں پھیلائی ہے
اس کی شادابیوں کے لیے
میری سب انگلیاں —
ہوا میں دعائیں لکھ رہی ہیں!"

○

پروفیسر آلِ احمد سُرور، معین صاحب کو بے حد عزیز اور محترم رکھتے ہیں (اور تکلف برطرف مجھے بھی!) اس صورت میں زیرِ نظر کام کو اپنے ہاتھ میں لینے کے لیے کوئی اعتذار، جواز یا سندِ استحقاق پیش کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی۔ سرور صاحب کی اس "آپ بیتی" کو متشکل کرنے میں خود مجھ پہ کیا بیتی، اس حکایت کو چھیڑنا بھی لاحاصل ہے۔ سخن فہم بن کے بھی نشاطِ کار اور میری مشکلات کا اندازہ کر سکتے ہیں اور "طرف داروں" پر سرور صاحب کے یہ "دو حرف" (بھی شاید کارگر نہ ہوں!):

" جو لوگ اقتباسات کو دیکھتے ہیں، اُس تلاش اور جستجو کو نظر انداز کر دیتے

ہیں جو اقتباسات کے انتخاب میں صرف ہوتی ہے اور ہونی چاہیے، وہ ادب کا کوئی اچھا تصور نہیں رکھتے اور اُن کی ذہنی استعداد کے متعلق کوئی اچھی رائے قائم نہیں کی جاسکتی ۔"

[تنقید کیا ہے، ص۱۹۳]

فیصل آباد،



مری خلق محوِ کلام سب، مجھے چھوڑتے ہیں خموش کب،
مرا حرف رشکِ کتاب ہے، مری بات لکھنے کا باب ہے

— میر

# حرفِ سُرور

[ابوابِ کتاب]


۱۔ میرا سفرِ حیات

۲۔ بچپن کے اثرات اور تعلیم

۳۔ آگرہ میں چار برس

۴۔ علی گڑھ میں ورود

۵۔ معلّمی کا آغاز اور اعزاز

۶۔ دس برس علی گڑھ سے دُور

۷۔ کچھ اہم واقعات

۸۔ میری پسندیدہ کہانیاں

۹۔ میری شاعری

۱۰۔ تنقید کے بارے میں میرے تصورات

۱۱۔ تنقید کے مسائل

۱۲۔ اردو میں ادبی تنقید کی صورتِ حال

۱۳۔ میرا تنقیدی اور ادبی نقطۂ نظر

۱۴۔ بطور نقاد مجھ سے کچھ سوال

۱۵۔ میری تنقیدی تصنیفات

۱۶۔ کچھ دن پاکستان میں

۱۷۔ آرزوئیں اور ارادے



E Books
WHATSAPP GROUP

(۱)

# میرا سفرِ حیات

rekhta

راستہ چلنا[1] آسان ہوتا ہے مگر چلتے چلتے اپنا جائزہ لینا اور اپنے سفر پر حکم لگانا مشکل ہے، خود اپنے پر تنقیدی نظر ڈالنا، اُن اثرات کا پتہ چلانا جو شخصیت کے بننے میں معاون ہوئے ہیں، اُن اشخاص کی سیرت کے اہم نقوش کو ذہن میں تازہ کرنا جن سے خود اپنا نقش بنا ہے، اُن واقعات کا تجزیہ کرنا جنھوں نے کسی نہ کسی طرح سیرت، کردار، مزاج، طبیعت کو آب و رنگ دیا ہے، غرض اپنے آپ کو محرکات سے پہچاننا ایک جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہو سکتا ہے کہ وہ اثرات تو میری نظر میں ہوں جو سامنے سے آئے ہیں مگر جو چور دروازے سے داخل ہو گئے ہیں، اُن کی مجھے خبر نہ ہو۔ ہو سکتا ہے کہ میں چاند سورج کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا ہوں اور اُن ستاروں کی مجھے خبر نہ ہو جن کی مدھم اور خنک روشنی میری شخصیت میں نفوذ کر رہی ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میں برق و رعد کے جلال سے متاثر ہو رہا ہوں اور سُرمئی شاموں اور کہر میں لپٹی ہوئی صبحیں مجھے یاد نہ ہوں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کوئی خاص لمحہ اس طرح تجلّی بن کر میرے سامنے آیا ہو کہ کائنات ایک نوری غبار میں

---

[1] شخصیات اور واقعات، ۵ - ۶

اٹی ہو اور اب اس نوریں غبار کی ایک دھندلی سی یاد ہی رہ گئی ہو اور یہ بھی ناممکن نہیں کہ کوئی بادل کا ٹکڑا بار بار اس طرح سامنے آجاتا ہو کہ اس سے بے رحم حقیقت کی کرنیں ایک دلفریب دُھندلکے میں چھپ چھپ جاتی ہوں اور وہ دُھندلکا بھی تحریر ہو گیا ہو۔

میرا حال اُس مسافر کا ہے جسے پتہ نہیں کہ وہ کس منزل کی جستجو میں روانہ ہوا تھا اور کب، ہاں ایک اضطراب مُسلسل اور ایک پیہم خلش کا احساس ضرور ہے۔ اپنے سفر کی ابتدا کو یاد کرتا ہوں تو مشہور امریکن شاعر رابرٹ فراسٹ[1] کی یہ سطریں ذہن میں آجاتی ہیں۔

Somewhere, ages and ages hence
Two roads diverged in a wood, and I
Took the one less travelled by
And that has made all the difference.

○

[یہاں اختصار کے ساتھ سرور صاحب کی حیات کا ایک سلسلہ وار خاکہ پیش کر دینا شاید بے محل نہ ہو گا:[2]]

○

---

[1] پیدائش: سان فرانسسکو، ۲۶۔ مارچ ۱۸۷۴ء وفات: بوسٹن، ۲۹۔ جنوری ۱۹۶۳ء فراسٹ کا پہلا شعری مجموعہ "A Boy's will" ۱۹۱۳ء میں اور آخری مجموعہ "In the clearing" ۱۹۶۲ء میں شائع ہوا۔ سرور صاحب کی کتاب "مسرت سے بصیرت تک" (مطبوعہ ۱۹۷۴ء) کا نام، فراسٹ ہی کے ایک قول پر مبنی ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ سرور صاحب فراسٹ سے صوری مشابہت رکھتے ہیں [ز۔م]

[2] عرفانِ اقبال (مرتبہ: زہرا معین) صفحہ ۹-۱۱

نام : آلِ احمد صدیقی

تخلص : سُرور

عرفیت : عَلّو میاں

ولادت : بدایوں، ستمبر ۱۹۱۱ء

والد : کرم احمد صاحب

شادی : بیگم زاہدہ سُرور، ۱۹۳۶ء

## تعلیم :

میٹرک : وکٹوریہ ہائی اسکول، غازی پور، ۱۹۲۸ء

الف۔ ایس سی : سینٹ جانس کالج، آگرہ، ۱۹۳۰ء

بی۔ ایس سی : سینٹ جانس کالج، آگرہ، ۱۹۳۲ء

ایم۔ اے (انگریزی) : مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، ۱۹۳۴ء

ایم۔ اے (اُردو) : مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، ۱۹۳۶ء

## مصروفیات :

لیکچرار، شعبۂ انگریزی، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، اکتوبر ۱۹۳۴ء — ۱۹۳۶ء

لیکچرار، شعبۂ اُردو، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ ۱۹۳۶ء — ۱۹۴۵ء

پرنسپل، رضا کالج، رامپور ۱۹۴۵ء — ۱۹۴۶ء

ریڈر شعبۂ اُردو، لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ، اگست ۱۹۴۶ء — ۱۹۵۴ء

صدر شعبۂ اُردو و فارسی، لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ ۱۹۵۴ء — ۱۹۵۵ء

سید حسین ریسرچ پروفیسر، شعبۂ اُردو، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، دسمبر ۱۹۵۵ء — اپریل ۱۹۵۸ء

پروفیسر و صدر شعبۂ اُردو، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، مئی ۱۹۵۸ء — مارچ ۱۹۷۲ء

ڈائرکٹر تاریخِ ادبِ اُردو، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، مئی ۱۹۵۸ء — مارچ ۱۹۷۲ء

سیکرٹری انجمن ترقیِ اُردو (ہند)، علی گڑھ ۱۹۵۶ء — مارچ ۱۹۷۲ء

ایڈیٹر: سہ ماہی اُردو ادب، علی گڑھ ۱۹۵۰ء — مارچ ۱۹۷۲ء

ایڈیٹر: ہفت روزہ ہماری زبان، علی گڑھ جنوری ۱۹۵۶ء — مارچ ۱۹۷۲ء

وزٹنگ فیلو، انسٹی ٹیوٹ آف ایڈوانسڈ

اسٹڈیز، شملہ: یکم اپریل ۱۹۷۲ء — مارچ ۱۹۷۷ء

اقبال پروفیسر کشمیر یونیورسٹی، سری نگر اپریل ۱۹۷۷ء — مئی ۱۹۷۹

ڈائرکٹر، اقبال انسٹی ٹیوٹ، کشمیر یونیورسٹی

سری نگر: اپریل ۱۹۷۹ء تا حال

ایڈیٹر: ششماہی اقبالیات (اردو، انگریزی)، مجلہ کشمیر یونیورسٹی، سری نگر

## تنقیدی مجموعے:

۱۔ تنقیدی اشارے ۱۹۴۲ء

۲۔ نئے اور پرانے چراغ ۱۹۴۶ء

۳۔ تنقید کیا ہے؟ ۱۹۴۷ء

۴۔ ادب اور نظریہ ۱۹۵۴ء

۵۔ نظر اور نظریے ۱۹۷۲ء

۶۔ مسرت سے بصیرت تک ۱۹۷۴ء

۷۔ عرفانِ اقبال (مرتبہ: زہرا معین) ۱۹۷۷ء

۸۔ اقبال اور ان کا فلسفہ (مرتبہ: صدیق جاوید) ۱۹۷۷ء

۹۔ اقبال اور نظریۂ شعر اور شاعری ۱۹۷۹ء

## شعری مجموعے :

۱۔ سلسبیل ، ۱۹۳۶ء

۲۔ ذوقِ جنوں ، ۱۹۵۵ء

## آپ بیتی :

حرفِ سرور (مرتبہ : زہرا معین) ، ۱۹۸۰ء

## مُرتّبات :

۱۔ انتخابِ جدید ، ۱۹۴۴ء

۲۔ مقالاتِ یومِ اقبال ، ۱۹۴۵ء

۳۔ عرفانِ غالب ، ۱۹۷۳ء

۴۔ عکسِ غالب ۱۹۷۳ء

۵۔ تنقید کے بنیادی مسائل ، ۱۹۷۴ء

۶۔ جدیدیت اور ادب ، ۱۹۷۵ء

۷۔ اُردو فکشن ۱۹۷۵ء

۸۔ اقبال اور تصوّف ۱۹۸۰ء

۹۔ اقبال اور مغرب ۱۹۸۰ء

rekhta

## زیرِ ترتیب کتابیں :

۱- انگریزی ادب کا، اُردو ادب پر اثر (انگریزی)

۲- اُردو ادب کی تاریخ (انگریزی)

۳- دیوانِ غالب (انگریزی ترجمہ)

۴- انگریزی مضامین کا مجموعہ

۵- افکار کے دیئے ("ہماری زبان" کے اداریوں کا انتخاب)

۶- شخصی خاکے ۷- متفرق مضامین

۸- میر پر کتاب ۹- اقبال پر کتاب

۱۰- غالب پر کتاب ۱۱- سفر نامہ

۱۲- مجموعۂ کلام ۱۳- اقبال کا فن (سیمینار)

۱۴- تشخص کی تلاش اور اقبال (سیمینار)

rekhta

(۲)

# بچپن کے اثرات اور تعلیم

rekhta

پہلے میں اپنا[1] مختصر تعارف کرادوں اور اُن اثرات کا تذکرہ کردوں جو بچپن میں پڑے۔ بچپن کے یہ اثرات میرے ذہن میں گڈمڈ سے ہیں، مگر یہ احساس ضرور ہے کہ ان کا میری شخصیت کی تعمیر میں حصہ ضرور ہے اور انہیں کی وجہ سے میں، بعد میں بعض چیزوں سے زیادہ اور بعض سے کم متاثر ہوا۔

میں بدایوں کے ایک متوسط خاندان میں پیدا ہوا۔ پیدائش کا سال ستمبر ۱۹۱۱ء ہے۔ میرے والد ڈاک خانے میں ملازم تھے اور باہر رہتے تھے۔ میری والدہ زیادہ تر میکے میں رہتی تھیں۔ میں زیادہ تر ننھال میں اور کبھی کبھار ددھیال میں رہتا تھا۔ پانچ برس کی عمر میں بسم اللہ ہوئی۔ مولانا عبدالماجد بدایونی نے بسم اللہ پڑھائی۔ اپنے ایک ماموں کے مکتب میں، میں نے اُردو اور قرآن شریف شروع کیا۔ مولانا بزرگوں کے قصے سُنایا کرتے تھے، گھر کی بڑی بوڑھیاں کہانیاں سُناتی تھیں۔

ہمارے گھر میں بیت بازی کا بہت رواج تھا، جس میں گھر کی عورتیں اور بچے سب ہی

---

[1] شخصیات اور واقعات، ص ۶ - ۱۱

حصہ لیتے تھے۔ بدایوں میں بزرگوں کے عرس بہت ہوتے اور میں بھی بڑوں کے ساتھ جایا کرتا۔ ان عرسوں میں مولویوں کے وعظ دلچسپ معلوم ہوتے مگر زیادہ دلچسپی نعت و منقبت میں ہوتی۔ میں ہم عمروں کے کھیلوں، اونچا نیچا، گلی ڈنڈا اور کبھی کبھی جرمن اور انگلستان کی لڑائی میں شریک ہوتا، مگر زیادہ دلچسپی بڑوں کے پاس بیٹھ کر اُن کی باتیں سُننے میں تھی۔ پڑوس میں ایک پرانے زمیندار مولوی عطا احمد تھے جو ہمارے دُور کے عزیز بھی تھے۔ یہ بزرگوں کی شان میں قصیدے لکھتے، روز کچہری جاتے اور گاؤں کے پھیرے کرتے رہتے تھے۔ شام کو دوستوں کے مجمع میں اپنے قصیدے سُنایا کرتے تھے، کبھی کبھار شعر پر تنقید بھی ہوتی۔ مجھے ان سب باتوں سے بڑی دلچسپی تھی، سینکڑوں شعر یاد ہو گئے تھے۔

اُس زمانے میں بدایوں میں خلافت کی تحریک کا بڑا زور تھا۔ جامع مسجد میں روز جلسے ہوتے، شہر میں لیڈروں کے جلوس نکلتے ان جلسوں میں ضرور شریک ہوتا۔ ایک دفعہ ایک دوست کے ساتھ عورتوں سے ایک ایک پیسہ چندہ کر کے ایک روپیہ جمع کیا اور محلّے کے کارکن کو دے دیا۔ کتنی ہی نظمیں یاد کر لی تھیں، غرض عجیب زمانہ تھا۔

میں نے اردو پڑھنے کے بعد فارسی شروع کی۔ مگر 'گلستان' کے چند باب پڑھ پایا تھا کہ انگریزی کی طرف موڑ دیا گیا، اور کنگ ریڈر شروع کرا دی گئی۔ اِدھر اُدھر کی باتیں پڑھنے کا شوق چھوٹی عمر سے ہو گیا تھا۔ آٹھ نو سال کی عمر میں میرا نام پیلی بھیت کے انگریزی اسکول میں لکھا دیا گیا۔ اب ہمارا سارا گھر پیلی بھیت منتقل ہو گیا تھا۔ اس وقت ہم چار بہن بھائی تھے۔ والد کو دفتر سے اور والدہ کو گھر سے فرصت نہ ملتی، بڑے بہن بھائی مجھ سے بہت بڑے تھے۔ چنانچہ میں اپنا وقت دفتر کے کلرکوں، چپراسیوں اور کبھی کبھار والد صاحب کے ملنے والوں کے ساتھ گزارا کرتا۔

اس زمانے میں والدہ رات کو اُردو یا انگریزی کی کوئی کتاب ضرور پڑھتے تھے میں بھی اسے چوری چھپے ضرور پڑھا کرتا۔ اس پر پٹا بھی مگر یہ عادت گئی نہیں۔ جب میں پانچویں درجے

میں تھا اور امتحان سر پر تھا تو میں ایک دن "فسانۂ آزاد" پڑھتے ہوئے پکڑا گیا۔ خوب مرمت ہوئی۔ والد نے بہت ڈانٹا کہ امتحان سر پر ہے اور یوں وقت خراب کیا جا رہا ہے۔ مگر میری سمجھ میں یہ نہ آتا تھا کہ جو چیز ایک دفعہ کلاس میں پڑھ لی ہے اور یاد ہو گئی ہے اسے پھر کس طرح پڑھا جائے۔ ایک دفعہ سنیچر کے دن ایک ماسٹر نے کہا کہ پیر کو آموختہ سنا جائیگا اور پورا سبق دو دفعہ پڑھ لیا جائے۔ پیر کو امتحان ہوا اور میں نے ہر سوال کا تسلی بخش جواب دیا۔ پوچھنے پر بتایا کہ ایک دفعہ سبق پڑھا تھا۔ ماسٹر نے اس بات پر مارا کہ جب دو دفعہ پڑھنے کو کہا تھا تو ایک دفعہ کیوں پڑھا۔ لطف یہ تھا کہ ایک دفعہ بھی نہیں پڑھا تھا اور ڈر کے مارے جھوٹ بولا مگر پٹائی سے نہ بچ سکا۔

یاد پڑتا ہے کہ دس گیارہ سال کی عمر میں مرآۃ العروس، توبۃ النصوح، الف لیلیٰ اور اس قسم کی بہت سی کتابیں پڑھ ڈالی تھیں۔ ایک دفعہ ایسا ہوا کہ گرمیوں کی چھٹیوں میں طلسم ہوشربا کی کئی جلدیں اور تاریخ ابن خلدون کے کئی حصے مل گئے۔ میرا برا حال تھا۔ کبھی ایک کو صبح سے دوپہر تک پڑھتا تھا، کبھی دوپہر سے شام تک دوسری کو۔ کچھ سمجھتا تھا کچھ نہیں، مگر سب پڑھ جاتا تھا۔

پانچویں درجے سے کچھ ایسا اتفاق ہوا کہ اسکول ڈاک خانے سے ڈیڑھ دو میل دور ہوتا۔ میں پیدل جایا کرتا۔ کبھی کوئی ساتھ ہوتا کبھی نہیں۔ گھر سے بھلا اور خیالی پلاؤ پکانا شروع کیا کبھی بادشاہ بنتا، کبھی سپہ سالار، کبھی بانی، کبھی مصنف، اس طرح بغیر فاصلے کی دوری یا دھوپ کی تمازت محسوس کئے اسکول یا گھر پہنچ جاتا۔ خیالی پلاؤ پکانے کی عادت اب کم ہو گئی ہے مگر چھوٹی نہیں۔ لطف یہ ہے کہ ایک ذہنی تصویر سے طبیعت اکتائی اسے ہٹا کر دوسری بنانی شروع کر دی۔

کلاس میں ہر مضمون میں ہمیشہ اچھا رہا سوائے حساب کے جو کبھی قابلِ اطمینان نہ ہوا۔ ساتویں آٹھویں درجے میں ہی، میں اردو خاصی لکھ لیتا تھا۔ شعر بھی موزوں کر لیتا تھا انگریزی

اخبار کے مطالعے کا شوق ہو چکا تھا۔ اردو میں اخبار "مدینہ" برابر پڑھا کرتا۔ بانگِ درا" کی بہت سی نظمیں یاد تھیں۔ فانی کی غزلیں جھوم جھوم کر پڑھا کرتا تھا جلسوں میں شرکت ضرور کرتا تھا۔ کوئی قومی رہنما شہر میں آتا تو اُس کی تقریر سننے ضرور جاتا۔ آٹھویں درجے میں تھا کہ علی گڑھ میں پچاس سالہ جوبلی کی تقریب ہوئی۔ والد کی خوشامد کر کے اُن کے دوستوں کے ساتھ غازی پور سے علی گڑھ آیا۔ افتتاحی اجلاس کی شان و شوکت، سیدین صاحب کی ایک مباحثے میں تقریر، مشاعرے کا منظر آج تک یاد ہیں ــــ

اسکول کا زمانہ زیادہ تر سیتا پور، گونڈے اور غازی پور میں گزرا۔ پورب کے ان اضلاع میں مسلمان طلبہ کلاس میں کم ہوتے تھے اور اُستاد خال خال، مگر مجھے اُستادوں کی شفقت اور ساتھیوں کی محبت ہمیشہ ملی۔ باپ قوم پرست خیالات رکھتے تھے۔ میرے ایک اُستاد ماسٹر رام ناتھ مجھ پر اس طرح مہربان تھے کہ دوسرے طالب علم رشک کرتے تھے۔ چنانچہ تنگ نظری اور تعصب مجھ میں کسی زمانے میں پیدا نہ ہوا۔ ہائی سکول میں ایک دفعہ اپنی مرضی کے خلاف ساتھیوں کے کہنے سے اسٹرائیک کر دی اور امتحان کے کمرے سے باہر آگیا۔ میں چونکہ کلاس میں سب سے تیز تھا اس لئے سب کا لیڈر کہا۔ مہینے ڈیڑھ مہینے تک ہمارے جلسے ہوتے رہے۔ میں باقاعدہ انگریزی میں جلسوں کی روداد میں لکھتا تھا اور تقریریں کرتا تھا۔ امتحان کی قربت کی وجہ سے سارا معاملہ جلد ٹھنڈا ہو گیا۔ ہیڈ ماسٹر پھر مہربان ہو گئے۔

ماسٹر رام ناتھ کی شفقت و محبت آج تک یاد ہے یہ ایسی اچھی انگریزی بولتے تھے کہ پروفیسر کہلاتے تھے۔ کھیل کود سے بھی انھیں دلچسپی تھی۔ کرکٹ ہٹ اچھی کھیلتے تھے۔ میں صرف تماشائی تھا۔ کہتے تھے کہ مجھے گرامر نہیں آتی اور اس کی ضرورت بھی کبھی محسوس نہیں ہوئی۔ میری گرامر سے بے پروائی شاید انھیں کے اثر کا نتیجہ ہو۔ ماسٹر رام ناتھ مندروں کی کچھ رسموں پر اکثر اعتراض کرتے تھے۔ انگریزوں کے بہت دلدادہ تھے۔ وہ

مسلمانوں کی بعض باتوں سے بھی متاثر تھے۔ غرض بڑے وسیع القلب اور روادار آدمی تھے۔ میری شخصیت کی تعمیر میں ان کا خاموش اثر ضرور ہے۔

ہائی اسکول کا امتحان میں نے بنارس سے دیا۔ چند دوست ساتھ تھے۔ دن بھر ہم لوگ پڑھتے۔ شام کو بنارس کے گھاٹوں اور گلی کوچوں کی سیر کرتے۔ ہائی اسکول تک میں نے انگریزی کی بہت سی مستند ناولیں پڑھ ڈالی تھیں۔ معلوماتِ عامہ کے لحاظ سے بھی کسی سے کم نہ تھا۔ سیاسی مسائل پر بڑے جوش سے اظہارِ خیال کرتا۔ موتی لال نہرو کی پارلیمنٹ میں تقریریں اب تک یاد ہیں۔ کسی نے طعنہ دیا تھا کہ کانگریس آزادی کے لئے قربانی نہیں دینا چاہتی، یہ تو اقتدار اور عہدے چاہتی ہے۔ اس پر انہوں نے کہا تھا:

"Our ambition our highest ambition is to be buried in the foundation of a free India, to be buried there to be there, but with the satisfaction that the noble edifice of India's freedom, shall rise on our bones."

(۳)

# آگرہ میں چار برس: کالج کا دور

۱۹۲۸ء[۵۱] میں مَیں نے وکٹوریہ ہائی اسکول، غازی پور سے ہائی اسکول پاس کیا اور سینٹ جانس کالج آگرہ میں فرسٹ ایئر سائنس میں داخلہ لیا۔ ہائی[۵۲] اسکول میں پرچے اچھے ہوئے تھے مگر حساب میں واجبی ہونے کی وجہ سے سیکنڈ کلاس ملا۔ اس کے بعد چچا کے پاس آگرے بھیج دیا گیا۔ یہاں سینٹ جانس کالج میں فرسٹ ایئر سائنس میں نام لکھایا گیا۔ والدین کا خیال تھا کہ ڈاکٹری سکھائیں۔ مجھے سائنس سے دلچسپی نہ تھی مگر بغاوت کی بھی ہمت نہ تھی۔ (۱۹۲۹ء) کی بات ہے جب[۵۳] مَیں کالج میں نیا نیا داخل ہوا تھا میں سائنس کا طالبِ علم مگر ادب سے دلچسپی زیادہ تھی — کلاس میں پروفیسر کیمیا اور طبیعات کے فارمولے یا تجربات بیان کرتے اور ہم پیچھے بیٹھے اُردو کے شاعروں کا کلام پڑھتے یا اُن کے حالات اور تذکرے دیکھتے۔

---

۵۱۔ ذوقِ جنوں، صفحہ ۵

۵۲ شخصیات اور واقعات، ۱۱

۵۳ ادب اور نظریہ، ۷۵

اس زمانے میں داغؔ کا کلام بڑا مزیدار معلوم ہوتا تھا، مگر اس کی شوخی اور شرارت میں کچھ بازاری پن کا احساس ہوتا تھا۔ حسرتؔ کی غزلیں زیادہ اچھی معلوم ہوتیں اور جوشؔ اور اخترؔ شیرانی کی نظمیں —— اس زمانے میں جنگل کی شہزادی، ناسزا جوانی، دیکھو وہ کوئی جوگن جنگل میں گا رہی ہے، تمھیں ستاروں میں بے اختیار دیکھا ہے، تیری تصویر سینے سے لگا دوں اور مر جاؤں، پڑھنا اور دوسروں کو سُنانا میرا ایک محبوب مشغلہ تھا۔ اخترؔ کی سلمیٰ اُس وقت ایک عجیب آسمانی مخلوق معلوم ہوتی۔ اس کی تصویر کو سینے سے لگا کر مرجانا زندگی کا ایک مقدس فریضہ نظر آتا۔ اتنا اب بھی یاد ہے کہ جوشؔ کی نظمیں ایک طوفان کی طرح بہا لے جاتیں، مگر اخترؔ شیرانی کے اشعار میں ایک نشہ ہوتا تھا، ایک لذت ہوتی تھی جو تھوڑی دیر کے لئے کسی اور دُنیا میں پہنچا دیتی تھی۔ چار[1] سال آگرے میں گزرے، یہاں فانیؔ بدایونی، میکشؔ، حامد حسن قادری سے ملنے کا موقع ملا۔ مجازؔ اور جذبیؔ (جو اُن دنوں ملالؔ تخلص کرتے تھے) مجھ سے ایک سال پیچھے تھے۔ کالج میں اکثر ادبی محفلیں اور مشاعرے ہوتے۔ ان میں مَیں بھی حصہ لیتا۔ سائنس کا طالب علم ہونے کے باوجود "انجمن ترقیِ اُردو" کا سکریٹری بھی رہا۔ کالج میگزین میں میرے مضامین، افسانے، نظمیں اور غزلیں بھی طبع ہوئیں۔ اُسی زمانے میں فانیؔ اور مانیؔ جائسی نے رسالہ "تسنیم" نکالا۔ اس میں کچھ افسانے لکھے۔

(میں فرسٹ ایئر میں) انگریزی[2] اور اُردو ادب اور معلوماتِ عامہ کی کتابیں پڑھا کرتا مگر سائنس کا اچھا طالب علم سمجھا جاتا تھا۔ اُس زمانے میں ہر طالب علم کو عہد نامہ جدید کا ایک نسخہ کالج کی طرف سے دیا گیا۔ مَیں نے اُسے پڑھنا شروع کیا اور اس کی زبان سے بہت متاثر ہوا۔ کچھ مسلمان دوستوں کو میرا انجیل سے یہ شغف گوارا نہ ہوا، اور انھوں نے کتاب غائب کر دی۔

---

[1] ذوقِ جنوں، صفحہ د، ن

[2] شخصیات اور واقعات° ۱۲ - ۱۴

Hasnain Sialvi



کالج کی یونین میں، سائنٹفک سوسائٹی میں، اور اُردو سوسائٹی میں، برابر شریک ہوتا رہا۔ تقریر کرنے کا شوق ہو گیا تھا۔ مجمع کے سامنے جانے میں مجھے ہمیشہ گھبراہٹ معلوم ہوتی مگر اس گھبراہٹ پر قابو پانے کی ہمیشہ کوشش کرتا رہا۔ کالج میگزین میں میری غزلیں، نظمیں اور مضامین شائع ہوئے۔

تین اُستادوں سے میں اُس زمانے میں خاص طور پر متاثر ہوا۔ ایک کیمسٹری کے اُستاد اشانی تھے، بڑے قوم پرست، معلّم اخلاق اور دلنواز شخصیت کے مالک، وہ کیمسٹری کم پڑھاتے تھے۔ علمی، تہذیبی اور قومی آداب پر زیادہ زور دیتے۔ یہ بنگالی تھے۔ دوسرے اسٹیل، انگریز تھے یہ بھی کیمسٹری پڑھاتے تھے، نوجوان آدمی تھے سیمابی فطرت رکھتے تھے۔ کلاس میں دوڑتے ہوئے داخل ہوتے۔ اکثر گھر پر بلایا کرتے۔ ان کی وجہ سے مجھے ناسپاتی کیمیا سے دلچسپی ہو گئی۔ تیسرے ملفورڈ، لمبے تڑنگے، بال آرائش سے بے نیاز، فلسفے کے اُستاد، مگر ہمیں انگریزی پڑھاتے تھے۔ ان سے ربط ضبط اس لئے بڑھا کہ میں انگریزی مضمون لکھتا تھا، اور یہ کالج میگزین کے ایڈیٹر تھے۔

سائنس کے طالبِ علم انگریزی میں نیازمند اور معلوماتِ عامّہ میں کورے سمجھے جاتے تھے۔ میں فرسٹ ایئر میں آرٹس، سائنس کامرس میں فرسٹ آیا اور معلوماتِ عامّہ میں آرٹس، سائنس کامرس میں فرسٹ ایئر سے فورتھ ایئر تک سب سے زیادہ نمبر پائے۔ ہمارے ڈین فیکلٹی آف سائنس ڈاکٹر پانڈیا خوشی کے مارے اتنے بے حال ہوئے کہ کالج اسٹاف کی میٹنگ میں آرٹس اور کالج کے اساتذہ کو طعنے دینے لگے۔

اُس زمانے میں، میں نے ہارڈی کے بہت سے ناول پڑھے اور اب تک یاد ہے کہ ایف۔ ایس سی میں "Jude the obscure" پڑھ کر بے اختیار رونے لگا۔

ل Jude The obscure بہت حد تک ٹامس ہارڈی (۱۸۴۰ء - ۱۹۲۸ء) کے فلسفۂ حیات کی آخری دستاویز ہے، جس میں جدید تہذیب کی تشنج کیفیات کا دلدوز نقشہ ملتا ہے۔ [ڈاکٹر محمد یٰسین، انگریزی ادب کی تاریخ، ص ۲۹۸]

سیکنڈ کلاس ملا تو میں نے چاہا کہ آرٹس لے لوں مگر والد نے بی۔ایس سی کرنے کا مشورہ دیا۔ مسٹر مہاجن جو کالج میں انگریزی کے شعبے کے صدر تھے، چاہتے تھے کہ میں آرٹس لے لوں مگر والد اور چچا کی مرضی کے خلاف کرنے کی ہمت نہ پڑی۔

میں تھرڈ ایئر میں تھا کہ نمک کی سالگرہ اور سول نافرمانی کی تحریک شروع ہوئی۔ گاندھی جی آگرے آئے انھیں دیکھنے کا بڑا اشتیاق تھا مگر ان کی تقریر سن کر بڑی مایوسی ہوئی۔ اس زمانے میں، میں تقریر میں خطابت کی آن بان ڈھونڈھتا تھا۔ گاندھی جی ٹوٹی پھوٹی ہندوستانی بول رہے تھے۔ کچھ دنوں کالج سول نافرمانی کی وجہ سے بند ہو گیا۔ میں ہر جلسے میں شریک ہوتا۔ ان چیزوں سے دلچسپی بڑھتی گئی مگر کوئی عملی قدم اٹھانے کی ہمت نہ ہوئی۔

تھرڈ ایئر میں ہوسٹل میں آگیا تھا۔ کچھ دن دوستوں کے ساتھ انگریزی تصویریں دیکھنے میں گزارے۔ دن بھر کالج کی دلچسپیوں میں گزرتا رات کو کھانے کے بعد پڑھا کرتا دیر تک جاگنے اور دیر سے اُٹھنے کی عادت اُس زمانے میں پڑی جو اب تک نہیں گئی کالج کے زمانے میں مسرت اور چشتی سے دوستی ہوئی جو ادارے کے بہترین طالب علم تھے دونوں اب سرکاری افسر ہیں۔

مجاز[1] اور جذبی سے بھی اس زمانے (۱۹۲۹ء) میں ملاقات ہوئی۔ جب وہ اور جذبی، جو اس وقت ملال تخلص کرتے تھے، فرسٹ ایئر سائنس میں سینٹ جانس کالج آگرہ میں داخل ہوئے میں اُن سے ایک سال آگے تھا۔ کالج کے مشاعروں میں مجاز اور جذبی دونوں شریک ہوتے تھے۔ تھرڈ ایئر میں[2] میں جنرل سکریٹری کے عہدے کے لئے اُمیدوار ہوا اور ایک بہت معمولی ہندو طالب علم کے مقابلے میں ہار گیا۔ فورتھ ایئر میں لٹریری سکریٹری کے عہدے کے لئے کھڑا ہوا اور چند ووٹوں سے پھر ہار گیا فرقہ پرستی کے اس مظاہرے سے رنج ہوا مگر میرے خیالات نہ بدلے۔

---

۱ شخصیات اور واقعات، ۱۴

۲ شخصیات اور واقعات، ۱۴

۳ مسرت سے بصیرت تک، ۲۲۸

بی ایس سی یہ تھیوری میں فرسٹ کلاس نمبر آئے مگر پریکٹیکل میں کم آنے سے کچھ نمبر سے فرسٹ کلاس رہ گیا تو سائنس چھوڑنے کا قطعی ارادہ کرلیا۔ (۱۹۳۲ء) کی بات ہے۔

میں بی۔ایس سی کا امتحان دے رہا تھا۔ اس زمانے میں کیمسٹری کے پروفیسر نے فورتھ ایئر کے طلبار کی دعوت کی۔ اس دعوت میں مَیں نے ایک نظم پڑھی تھی جس میں سائنس اور اس کی مُروّجہ تعلیم کو سخت بُرا بھلا کہا گیا تھا۔ اُس زمانے میں مجھے گھنٹوں خُشک اور بظاہر بے مقصد تجربے کرنے پڑتے تھے۔ درجنوں طول طویل فارمولے دیکھنے پڑتے تھے اور سینکڑوں پودوں، ہڈیوں اور کیمیائی اجزا کے نام یاد رکھنے پڑتے تھے۔ مَیں سائنس کا اچھا طالبعلم سمجھا جاتا تھا، اس لئے اس نظم پر پہلے تو سب کو حیرت ہوئی لیکن لوگ جانتے تھے کہ مجھے شعروادب سے کتنی گہری دلچسپی ہے، اس لئے بات آئی گئی ہوئی۔

مگر اب سوچتا ہوں تو یہ احساس ہوتا ہے کہ مجھے سائنس کی تعلیم سے بے اندازہ فائدہ پہنچا، اس لئے اب میری رائے ہے کہ ہائی اسکول تک سائنس کی تعلیم لازمی ہونی چاہیئے، اس کے بعد اختیاری۔ سائنس نے مجھے ہر چیز کو ایک خاص عینک سے دیکھنے کے بجائے اس کے اپنے رنگ میں دیکھنا سکھایا، سائنس نے مجھے خارجیت سکھائی، سائنس نے اس سوال کو پس پُشت ڈال دیا کہ مَیں کیا چاہتا ہوں یا کیا پسند کرتا ہوں۔ بلکہ یہ سکھایا کہ یہ کیا اور کیسا ہے؟ سائنس نے مجھے خوبیوں اور خامیوں کو پرکھنا سکھایا، سائنس نے بنیادی اور جُزوی باتوں میں فرق کرنا سکھایا ––– اور تنقید میں مجھے اس سے بڑی مدد ملی ہے۔[۵] (بہرحال) بی ایس سی میں .... کچھ نمبر سے فرسٹ کلاس رہ گیا تو سائنس چھوڑنے کا قطعی ارادہ کرلیا اور علی گڑھ پہنچ کر انگریزی میں ایم اے کا داخلہ لیا۔ مَیں ۱۹۳۲ء[۶] میں ایم اے کرنے علی گڑھ آیا۔ علی گڑھ[۷] کا مجھ پر بڑا اثر ہے، مگر میرے کردار اور اقدار کی

---

۵۔ تنقید کیا ہے، ۹ | ۶۔ شخصیات اور واقعات، ۱۴

۷۔ مسرت سے بصیرت تک، ۲۲۸ | ۸۔ شخصیات اور واقعات، ۱۴

تشکیل میں سینٹ جانس کالج کا اثر بھی کم نہیں۔ اس نے مجھے تمام مذاہب کا احترام سکھایا۔ اس نے میرے ذہن کو رواداری، اخلاق، دردِ قومی سے آشنا کیا۔

یہاں مجھے ایسے اُستاد ملے جو علم سے لگن اور طلبہ سے محبت رکھتے تھے اور سرکار کو ایک مقدس اور خوشگوار فریضہ سمجھ کر کرتے تھے۔ یہیں مجھے طلبہ کے مسائل سے دلچسپی ہوئی۔ یہیں وطن سے محبت اور فرقہ پرستی سے نفرت سیکھی ممکن ہے یہ سب کالج کی دین نہ ہو۔ میری اُفتادِ طبع کا نتیجہ ہو۔ مگر اتنا تو کہہ سکتا ہوں کہ علی گڑھ پہنچا تو یہ سب چیزیں ساتھ لایا تھا۔ ہندوستان میں عیسائیوں کے جو ادارے ہیں، کچھ لوگ خواہ مخواہ ان سے بدظن ہیں۔ ان اداروں نے اچھی تعلیم اور اچھی تربیت کا ایک معیار قائم کیا ہے جسے ملک کبھی نظرانداز نہیں کر سکتا۔

۴

# علی گڑھ میں ورود

۱۹۳۲ء[1] میں علی گڑھ آگیا۔ ایف۔ ایس سی کے بعد ڈاکٹری پڑھنے کا ارادہ تھا مگر یہ خیال ترک کرنا پڑا۔ بی۔ ایس سی کے بعد اپنی اُفتادِ طبع کا پورا اندازہ ہوا اور میں نے انگریزی میں ایم۔ اے کرنے کا ارادہ کرلیا۔ انگریزی کے اساتذہ نے میری ہمّت بندھائی اور میں نے سائنس کو خیر باد کہہ دیا۔

مَیں ۱۹۳۲ء[2] میں علی گڑھ آیا۔ یہ راس مسعود کی وائس چانسلری کا زمانہ تھا چونکہ میرے والد کا تبادلہ علی گڑھ ہوگیا تھا، اِس لئے اُنہیں کے پاس رہنے لگا۔ دوسرے سال جب یونین کا نائب صدر ہُوا تو ایس ایس اسٹیٹ ہوسٹل میں چلا آیا۔

علی گڑھ میں سب سے پہلے خواجہ منظور حسین صاحب سے مُتاثر ہُوا۔ یہ میرے انگریزی کے اُستاد تھے۔ انگریزی ادب پر گہری نظر کے علاوہ، اُردو ادب کا بڑا اچھا ذوق رکھتے تھے۔ نہایت شرمیلے آدمی تھے۔ کلاس میں لیکچر دینے کے بجائے لیکچر پڑھا کرتے تھے۔ ان

---

[1] ذوقِ جنوں، صفحہ : ۶

[2] شخصیات اور واقعات : ۱۵

لیکچروں سے فائدہ اس وقت ممکن تھا جب خود بھی اچھا مطالعہ ہو۔ میرا انگریزی میں تخلیقی اُدب کا مطالعہ اچھا خاصا تھا مگر باقاعدہ نہ تھا۔ شروع شروع میں ان کے لیکچر بے کیف معلوم ہوئے مگر جب خود پڑھنا شروع کیا تو ان کی خوبیاں آشکار ہوئیں۔

منظور صاحب اچھے طلبہ کی بڑی مدد کرتے تھے۔ ان کو مناسب ہدایت کرتے، خود اپنے پاس سے کتابیں پڑھنے کے لئے دیتے۔ موقع موقع سے اردو ادب کے حوالے دیتے۔ خواجہ صاحب اس زمانے میں علی گڑھ میگزین کے نگران تھے۔ اُنھوں نے مجھے علی گڑھ میگزین کا ایڈیٹر بنا دیا۔ اس سلسلے میں رشید صاحب، سیدین صاحب اور علی گڑھ کے دوسرے اہلِ نظر سے ملنے کا اتفاق ہوا۔

(علی گڑھ میں) جاں نثار اختر[1] سے سب سے پہلے مجھے مجاز نے ملایا تھا۔ علی گڑھ میگزین کی ادارت کے لئے اس کے نگران خواجہ منظور حسین صاحب سے اُنھوں نے ہی ملنے پر زور دیا تھا۔ میری ادارت کے زمانے میں مجاز کی (چیزیں) .... میگزین میں چھپیں .... اسی زمانے میں علی گڑھ میں نئے خیالات کی رَو شروع ہوئی۔ ڈاکٹر اشرف یورپ سے واپس آگئے تھے۔ اختر رائے پوری بی۔ اے کرنے کے لئے آفتاب ہوسٹل میں مُقیم تھے، وہیں سبطِ حسن بھی تھے۔

اختر رائے پوری نے اپنا مضمون "اُدب اور زندگی" اسی زمانے میں لکھا تھا جب وہ رشید صاحب کے یہاں مقیم تھے۔ سبطِ حسن کے بعض ترجمے اور حیات اللہ انصاری کی کہانیاں بھی مَیں نے علی گڑھ میگزین میں شائع کی تھیں۔ سجاد ظہیر آکسفورڈ میں ایک طویل عرصے تک قیام کرنے کے بعد علی گڑھ بھی آئے تھے۔ "انگارے" شائع ہوتے ہی ضبط ہو چکی تھی۔ میں نے میگزین میں اس پر سخت تنقید کی۔ خواجہ منظور حسین صاحب نگران تھے۔ وہ "انگارے" کو بعض ادبی تجربات کی وجہ سے پسند کرتے تھے۔ میرا مضمون اُنھیں پسند نہ آیا، مگر اُنھوں

---

[1] مسرت سے بصیرت تک، ۲۲۹

نے اس پر احتساب نہ کیا۔

خواجہ منظور حسین[1] صاحب ادب کے رسیا، کتابوں کے عاشق اور نہایت باذوق آدمی تھے۔ انھوں نے مجھے ڈاکٹر جانسن اس طرح پڑھایا کہ مجھے جانسن کی شخصیت سے ایک لگاؤ پیدا ہو گیا اور اس زمانے میں میں نے جانسن کی اہمیت پر رائے لٹریری سوسائٹی میں ایک مقالہ پڑھا۔ انھیں کے ذریعے سے میں ادب میں ترقی پسند تحریک سے روشناس ہوا۔ سجاد ظہیر، ڈاکٹر اشرف سے ملاقات انھیں کے ذریعے سے ہوئی۔ منظور صاحب آزادی ہند کے بعد لاہور چلے گئے۔ جاتے وقت مجھے لکھنؤ خط لکھا تھا تو غالب کا یہ شعر بھی اس میں درج تھا:

کعبے ہی جا رہا تو نہ دو طعنہ کیا کہیں
بھولا ہوں حق صحبتِ اہلِ کنشت کو!

خواجہ منظور صاحب سے میں شروع سے متاثر ہوا تھا مگر کچھ اُن کے رکھ رکھاؤ اور کچھ میرے حجاب نے مجھے ان سے زیادہ قریب نہ ہونے دیا۔

انگریزی[2] ادب کے مطالعے نے میری آنکھیں کھول دیں۔ خواجہ منظور حسین صاحب انگریزی ادب پر گہری نظر رکھنے کے علاوہ اردو ادب کے بھی رسیا تھے۔ انھوں نے انگریزی پڑھائی اُردو بھی لکھنے کا شوق دلایا۔ علی گڑھ میگزین کی ادارت میرے سپرد کی، پھر رشید صاحب نے "سہیل" کی ادارت میں شریک کر لیا۔

رشید احمد صدیقی[3] صاحب سے میری پہلی ملاقات غالباً نومبر ۱۹۳۲ء میں ہوئی۔ میں اسی سال انگریزی میں ایم۔ اے کر نے علی گڑھ پہنچا تھا اور علی گڑھ میگزین کا ایڈیٹر مقرر کر دیا گیا تھا۔ رشید صاحب سے ملنے کو جی چاہتا تھا، مضمون بھی حاصل کرنا تھا۔ ایک

---

[1] شخصیات اور واقعات، ۱۵
[2] ذوقِ جنون، صفحہ: نہ
[3] ادب اور نظریہ، ۱۳۶

عرصے سے رشید صاحب نے میگزین کے لئے کچھ نہ لکھا تھا۔ اُن کے مضمون "فلسفۂ ازدواج" کی اشاعت کے بعد کچھ ایسے پیچ پڑے تھے کہ رشید صاحب اور علی گڑھ میگزین ایک دوسرے سے دور ہو گئے تھے۔ میری آرزو یہ تھی کہ یہ بچھڑے پھر مل جائیں — کچھ دیر اُن کے مردانے مکان میں انتظار کرنا پڑا۔ رشید صاحب آئے .... رشید صاحب[۱] نے نہ کوئی آسمانی بات کی، نہ الہامی.... پہلی ملاقات میں بہت کم کھلتے ہیں۔ باتونی آدمی نہیں، اپنی آواز کے سننے میں اُنہیں لطف نہیں آتا۔ وہ نہ رُعب ڈالنا چاہتے ہیں، نہ رُعب میں آتے ہیں۔ غرض پہلی ملاقات میں یاد پڑتا ہے کہ مایوسی بھی تھی اور حیرت بھی۔ تاج[۲] محل کی شہرت اتنی ہے مگر پہلی دفعہ دیکھنے پر کچھ لوگوں کو کچھ مایوسی ہوتی ہے۔ آدمی جو خواب دیکھتا ہے وہ حقیقت بن جائے تو اس کی طلسمی فضا کچھ مدھم سی معلوم ہوتی ہے، یہی حال رشید صاحب کا ہے۔ اس لئے[۳] میری رائے رشید صاحب سے ملنے والوں کو یہ ہے کہ وہ پہلی ملاقات یا دو ایک ملاقاتوں سے رشید صاحب کے متعلق رائے قائم نہ کریں بلکہ اُس حجاب کو دور ہو جانے دیں جو ایسے موقعوں پر اُن پر طاری ہوتا ہے۔

رشید صاحب[۴] سے پہلی دفعہ میگزین کے لئے مضمون مانگنے کے لئے بلا تو رسمی ملاقات ہوئی۔ علی گڑھ والوں کو اصطلاح میں اُنھوں نے کچھ زیادہ لفٹ نہ دیا۔ دوسری دفعہ[۵] رشید صاحب کے یہاں حاضر ہوا تو چند دن پہلے میں یونین[۶] کے ایک آل انڈیا مباحثے میں تقریر کر چکا تھا جس میں وہ بھی جج تھے۔ اطلاع[۷] کرائی تو اُنھوں نے اندر بُلا لیا۔ بڑی[۸] محبت سے ملے... میری تقریر کی تعریف کی اور میگزین کے لئے مضمون کا فوراً وعدہ کر لیا اور.... اس وعدے کو وفا بھی کیا۔ اب کے[۹] وہ بڑے اخلاق سے پیش آئے اور مجھ پر لطف وکرم کی بارش کر دی

---

۱ ادب اور نظریہ، ۱۳۷    ۵ نئے اور پرانے چراغ، ۳۸۵

۲ ادب اور نظریہ، ۱۳۷    ۶ شخصیات اور واقعات، ۱۶

۳ ادب اور نظریہ، ۱۳۷    ۷ شخصیات اور واقعات، ۱۶

۴ ادب اور نظریہ، ۱۳۷    ۸ ادب اور نظریہ، ۱۴۸    ۹ شخصیات اور واقعات، ۱۶

میں اُن کے یہاں اکثر جانے لگا۔ ہر مسئلے پر گھنٹوں گفتگو ہونے لگی۔ اُن کا گھر اچھا خاصا مہمان خانہ تھا۔ ہر قسم کے لوگ آتے، ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈاکٹر عابد حسین، مولانا عبدالماجد دریاآبادی اصغر گونڈوی، سید سلیمان ندوی، حفیظ جالندھری، ان سب سے ملاقات رشید صاحب ہی کے یہاں ہوئی۔

رشید صاحب نے میرے اصرار پر میگزین کے لئے کئی مضمون لکھے۔ مجھے اپنے دوستوں سے ملایا۔ شروع شروع میں شعر و ادب کے عشق نے مجھے اصغر صاحب کا زیادہ گرویدہ رکھا۔ کچھ یاد پڑتا ہے کہ ذاکر صاحب سے کئی دفعہ یوں ہی سی ملاقات ہوئی مگر سال ڈیڑھ سال کے بعد دیکھتا ہوں تو بہت سے سامری فن پیچھے رہ گئے اور ذاکر صاحب کا کلمہ پڑھنے لگا۔

منظور صاحب نے مجھے عالمی معیاروں سے آشنا کیا اور انگریزی ادب سے عشق سکھایا۔ رشید صاحب نے مجھے اُردو ادب کی خدمت کی طرف مائل کیا۔ رشید احمد صدیقی اور خواجہ منظور حسین سے مختلف اوقات میں مجھے جو قیمتی مشورے ملتے رہے، اُن کی تفصیل بیان کرنا میرے لئے ناممکن ہوگا۔ ذاکر[1] صاحب نے (مجھے) ادب کو زندگی کی اعلیٰ قدروں سے ہم آہنگ کرنا سکھایا۔

ایم۔اے کے دوران میں یونین کا نائب صدر تھا۔ اس سلسلے میں راس مسعود صاحب سے ربط ضبط بڑھا جو وائس چانسلر تھے۔ ان کا حافظہ غضب کا تھا۔ فارسی اور اُردو کے ہزاروں شعر یاد تھے۔ گفتگو میں اُن کی جادوگری مشہور تھی، بڑے حوصلے اور عزم کے آدمی تھے مگر عملی قوت کم تھی۔ بہت سے ذہین آدمیوں کی طرح وہ خاصے آرام طلب تھے۔ علی گڑھ میں انھوں نے اچھے اچھے آدمی بلائے اور کئی مفید کام شروع کئے مگر ان میں اتنا استقلال نہ تھا کہ وہ کاموں کی خاطر قدم جما کر بیٹھتے۔ اس لئے میں ان کا قائل رہا مگر ان سے زیادہ متاثر نہ ہو سکا۔

---

[1] تنقیدی اشارے، ۸

[2] شخصیات اور واقعات، ۱۷

شاید ۱۹۲۴ء[۵۱] یا ۱۹۲۵ء کا زمانہ تھا۔ راس مسعود مرحوم علی گڑھ یونیورسٹی کی وائس چانسلری سے استعفیٰ دے کر بھوپال میں وزیرِ تعلیم ہو گئے تھے مگر تیسرے چوتھے مہینے میں وہ علی گڑھ چند روز کے لئے ضرور آیا کرتے تھے۔ انھیں اپنی والدہ سے بے حد محبّت تھی اور زیادہ دن تک وہ اُن سے الگ نہ رہ سکتے تھے۔ جب بھی وہ آتے، اُن کا گھر یونیورسٹی کے اربابِ ذوق کا مرجع بن جاتا۔ آٹھ دس اشخاص جمع ہیں۔ ادب، تاریخ، سیاسیات، مذہب، فلسفہ، فنونِ لطیفہ پر گفتگو ہو رہی ہے۔ راس مسعود مرحوم خود شعر پڑھ رہے ہیں یا تقریر کر رہے ہیں۔ میں بھی اکثر موجود ہوتا اور زیادہ تر مجھ سے انگریزی یا اُردو ادیبوں کے متعلق تبادلۂ خیال کرتے۔

ایم۔اے[۵۲] کرنے کے بعد والدین کی خواہش تھی کہ آئی سی۔ایس کروں مگر میرا دل معلّمی کو پسند کرتا تھا۔ ذاکر صاحب نے ایک دفعہ رواداری میں کہا تھا کہ آئی۔سی۔ایس کر کے کیا کیجئے گا، کچھ علی گڑھ اور اُردو کی خدمت کیجئے۔ یہ بات دل میں بیٹھ گئی اور ایسی بیٹھی کہ پھر نہ نکل سکی۔

سنہ ۱۹۳۴ء[۵۳] میں انگریزی میں ایم۔اے کر کے شعبۂ انگریزی میں لیکچرار ہو گیا تھا۔ سنہ ۱۹۳۶ء میں رشید صاحب کی تحریک پر اور ذاکر صاحب کے مشورے سے اُردو میں ایم۔اے کیا، اور اسی سال اپنی خدمات شعبۂ اُردو کو منتقل کرا لیں۔ اسی سال میری شادی ہوئی۔ جس سے محبّت اور رفاقت دونوں کا لُطف میسّر آیا۔

---

۵۱ تنقید کیا ہے، ۱۴۲

۵۲ شخصیات اور واقعات، ۱۷

۵۳ ذوقِ جنوں، ت، ح

۵

# مُعلّمی کا آغاز و اعزاز

مُعلّمی[1] کے پیشے اور اُردو ادب کی خدمت میں مجھے اب بھی وہ اعزاز و افتخار محسوس ہوتا ہے جو دولت و سیاست کی اُونچی مسند کو بھی نصیب نہیں۔ ۱۹۳۴ء میں یہ فیصلہ کیا تھا اُس وقت سے اب تک میری اور ملک کی زندگی میں کتنے نشیب و فراز آچکے ہیں مگر وہ روحانی طمانیت اور ذہنی سکون جو اس لگاؤ سے حاصل ہوا ہے اب بھی میرا رفیقِ سفر ہے۔

منظور صاحب کا اثر مجھ پر طالب علمی کے زمانے تک بہت گہرا رہا۔ ۱۹۳۴ء کے اکتوبر سے میں شعبہ انگریزی میں لیکچرار ہو گیا، مگر رشید صاحب اور ذاکر صاحب سے میرا قرب بڑھتا گیا۔ رشید صاحب کی ظرافت، خدمتِ خلق کا جذبہ، اُن کا علی گڑھ سے عشق، وہ گپ جس کو انھوں نے ایک فن بنا دیا ہے، نوجوانوں کی ہمت افزائی، دوستوں کی پاسداری، یہ چیزیں اُس زمانے میں بڑی کشش کا باعث تھیں۔ اُن کی خیال انگیز ظرافت اور ان کے جاندار اسلوب سے بھی میں خاصا متأثر تھا مگر علی گڑھ سے ان کا اس درجہ رومانوی عشق میری سمجھ میں کبھی نہیں آیا۔

---

[1] شخصیات اور واقعات، ۱۷

سرسید کی تحریک کا میرے دل میں بڑا احترام ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس نے ہندوستان کے مسلمانوں میں ذہنی انقلاب برپا کیا، اور انھیں اس قابل بنایا کہ وہ جدید دور کے تقاضوں کا ساتھ دے سکیں مگر ایم۔ اے۔ او کالج، سرسید کی فکرِ روشن کا صرف ایک گوشہ، وہ ان کے سنہرے خوابوں کی ایک ادھوری تعبیر اور ہماری تعلیمی، ادبی، سیاسی اور تہذیبی بساط پر صرف ایک تختۂ رنگین ہے، سارا چمن نہیں۔[۱]

رشید صاحب کو میں نے ہر رنگ میں دیکھا اور ہر وقت دیکھا (برسوں) اُن کے رفیق کی حیثیت سے بھی کام کیا (چالیس) برس سے میں اُن سے واقف ہوں۔ اُنھوں نے کبھی مجھ پر اپنی پوزیشن کا رُعب ڈالنے کی کوشش نہیں کی اُنھوں نے میرے سامنے کوئی ایسی بات نہیں کی جس پر مجھے آزردگی یا رنج ہو۔ میرے پیچھے میرے متعلق کوئی ایسی بات نہ کہی جس پر وہ شرمندہ ہو سکیں یا مجھے شکایت ہو۔ غرض زندگی، انسانیت، تہذیب اور اخلاقی صفات پر رشید صاحب کا زبردست اعتقاد ہمارے لئے ایک قیمتی سرمایہ ہے۔ اس سرمائے سے ہم کبھی بے نیاز نہیں ہو سکتے۔[۲]

ایک دفعہ رشید صاحب اور میں نواب چھتاری کے مہمان تھے۔ نواب صاحب اس وقت حیدر آباد کے صدر اعظم تھے۔ حیدر آباد میں اُردو کانفرنس تھی۔ ہم لوگ شاہ منزل میں ٹھہرائے گئے۔ ہر طرف آداب، تسلیمات، سیکریٹری، کلرک، چپراسی ہر اشارے پر موجود۔ نواب صاحب، بہت مہربان، دوسرا یا تیسرا دن تھا۔ ایک دن صبح کو ناشتے کے بعد میں کچھ خاموش بیٹھا ہوا تھا۔ رشید صاحب بھی چپ تھے۔ کچھ دیر کے بعد پوچھنے لگے "بھئی یہ آج آپ مہاتما بدھ کی طرح سوچ میں کیوں بیٹھے ہیں؟" میں نے کہا "سوچ رہا ہوں، بڑے پھنسے ہیں۔ ہم ٹھہرے چھ چھ پیسے والے آدمی مگر اب تو شوکیس میں سجا دیئے گئے ہیں۔"

---

۱؎ ادب اور نظریہ، ۱۳۸ ۔۔۔ ۲؎ ادب اور نظریہ، ۱۶۵

۳؎ نئے اور پرانے چراغ، ۲۹۸

چھ پیسے والے مال کو وہائٹ وے میں رکھ دیا جائے تو کیا ہو؟ رشید صاحب کے چہرے پر جیسے نور دوڑ گیا، کہنے لگے" میں بھی یہی محسوس کر رہا تھا، مگر جبس دم کئے ہوئے تھا دیکھ رہا تھا پہلے کون ہار مانتا ہے۔" اور اس کے بعد ہم لوگ جلد سے جلد وہاں سے بھاگے۔ اور مجھ سے زیادہ رشید صاحب خوش تھے۔

حیدر آباد کے اسٹیشن پر شوفر کو ٹپ کر کے ہم لوگوں نے ٹی اسٹال پر دو آنے پیالی والی چائے پی۔ مونگ پھلی والے سے مونگ پھلی خریدی۔ میں نے اخبار لیا۔ رشید صاحب نے اپنا بیگ کھول کر پاندان نکالا۔ پان بنایا اور پیک کو منہ میں تول کر بولے" سرور صاحب اب جان میں جان آئی ہے۔ یہ سرکاری درباری لوگ نہ جانے کیسے اس قدر باقاعدہ اور مہذب زندگی بسر کر لیتے ہیں۔" میں نے کہا" رشید صاحب برنارڈ شا نے کہا ہے" بات کاٹ کر بولے" دیکھیے حضرت یہ شیکسپیر اور شا کی بات اب علی گڑھ تک نہ ہوگی۔" میں نے کہا "اچھا اقبال کے اشعار پڑھنے کی تو اجازت ہے" کہنے لگے" ہاں اس میں مضائقہ نہیں۔"[۱]

ذاکر صاحب علی گڑھ کو عزیز رکھتے ہوئے بھی، اور اپنی چیز کسے عزیز نہیں ہوتی، اس کی خامیوں سے واقف تھے، ذاکر صاحب ان دیدہ وروں میں سے ہیں جو صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ انھوں نے علی گڑھ کی بستی چھوڑ کر جامعہ کے ویرانے میں پھول کھلائے تاکہ ملک کو قومی تعلیم کے تجربے سے آشنا کرائیں۔ انھوں نے مغرب کی حکمت اور مشرق کے سوز و دروں کو اپنی شخصیت میں اس طرح سمو لیا کہ ہر سیاسی دور کے لئے ایک آبِ حیات بن گئے۔ وہ فکر کی بلندی اور علم کی رفعت کے باوجود عمل کی راہ کو ہموار کرنے اور جامعہ کو قبولِ عام عطا کرنے میں کامیاب ہوئے۔ انھوں نے گاندھی جی سے گہری وابستگی اور آزادی کی سیاسی جد و جہد سے ذہنی ہم آہنگی کے باوجود تعلیمی کاموں کی اپنی اہمیت اور آزادی کو برقرار رکھا اور اسے وقتی سیاست کا غلام نہ ہونے دیا۔

---

[۱] شخصیات اور واقعات، ۱۸ - ۲۰

ذاکر صاحب ہی میں مجھے شروع سے ایک ایسا رہنما نظر آیا جو لیڈری نہیں کرتا۔ ساتھ چلتا ہے جو اپنے منصب کی نہیں دوسروں کی فکر رکھتا ہے۔ جسے اپنے اوپر اتنا اعتماد ہے کہ وہ ہمیشہ اپنے ساتھیوں کی آزمائش کے پھیر میں نہیں پڑتا ان کے اثر سے مجھے اپنا کام، ایک بڑے سلسلے کا جز نظر آیا۔ ادب میں نشہ ہی نہیں نجات کا سامان بھی مل گیا۔ زندگی صرف فارغ البالی اور خوش پوشی نہیں، بلکہ افکار، اقدار پر ایمان اور ان کے برتنے کا دوسرا نام بن گئی ہے۔

مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ ذاکر صاحب چاہتے تھے کہ میں جامعہ میں آجاؤں انھوں نے مجھ سے کبھی اس کا ذکر نہیں کیا اگر کرتے تو شاید میں ضرور چلا جاتا، مگر علی گڑھ میں مجھے درس و تدریس کے علاوہ شعر و ادب سے ایک گہرے لگاؤ اور اپنے مطالعہ کو وسیع کرنے کی دھن نے کچھ اور سوچنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ ہاں ذاکر صاحب سے جو لگاؤ، اس وقت ہو گیا تھا وقت کے ساتھ وہ گہرا ہی ہوتا رہا۔

میں نے جامعہ کی جوبلی بھی دیکھی، اور ذاکر صاحب کی علی گڑھ کی وائس چانسلری کا دور بھی دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ جوبلی میں ذاکر صاحب پر ایک عجیب جذب کا عالم طاری تھا۔ ان کی وہ تقریر جو انھوں نے کانگریس اور مسلم لیگ کے لیڈروں کے سامنے کی تھی آج بھی کانوں میں گونج رہی ہے۔ انھوں نے قومی تعلیم کے سفینے کو وقتی سیاست کے گرداب سے بچانے کی جو کوشش اس وقت کی تھی اس کے نتائج بھی سامنے ہیں۔

علی گڑھ میں ان کی وائس چانسلری بھی میں نے دیکھی ہے۔ انھوں نے بس طرح علی گڑھ کی اس وقت مدد کی جب اس کا وجود خطرے میں تھا، اسے قوم کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ یہ بھی جانتا ہوں کہ ذاکر صاحب مفکر ہیں، مدبر نہیں۔ وہ فرشتہ صفت آدمی ہیں، داؤ پیچ سے واقف نہیں۔ لوگوں نے ان کی سادگی سے فائدہ اٹھایا ہے اس سے ذاکر صاحب کا کچھ نہیں بگڑا۔ ذاکر صاحب اپنے راستے پر گامزن رہے وہ لوگ جہاں

تھے وہیں کے ہو کر رہ گئے۔

۳ - مئی [۱] (۱۹۶۹ء) کو ذاکر صاحب کے قلب کی حرکت اچانک بند ہو گئی، ۵ - مئی کو اُن کا جسم خاکی مٹی میں دبا دیا گیا۔ لاکھوں آدمی ان کی موت پر اشکبار تھے، کروڑوں نے یہ محسوس کیا کہ وہ روشنی کی ایک کرن، خوشبو کے ایک لطیف جھونکے، ابرِ کرم کے جاں بخش سائے سے محروم ہو گئے۔

ذاکر صاحب [۲] کی یاد کے ساتھ ذہن میں کتنی ہی تصویریں ابھر جاتی ہیں..... دوسروں کی نہیں اپنی کہتا ہوں۔ ذاکر صاحب نے میری زندگی پر اثر ڈالا ہے۔ ایم۔ اے کرنے کے بعد حسبِ دستور، سول کی تیاری کر رہا تھا۔ ذاکر صاحب نے باتوں باتوں میں میرے ذہن کی رَو بدل دی — اور میں نے معلّمی کو پیشہ ہی نہیں عشق بھی بنا لیا۔

علی گڑھ [۳] میں مجھے اَدیبوں، شاعروں، معلّموں، لیڈروں، سب سے ملنے کا اتفاق ہوا ان میں سب سے پہلا نقش سید سلیمان ندوی کی سنجیدہ گفتاری، علمیت اور ادبیت کا ہے۔ اس کے بعد ذاکر صاحب، رشید صاحب، سیدین صاحب، منظور حسین صاحب اور ڈاکٹر عابد حسین صاحب سے ربط ضبط بڑھا۔ ان سب نے میری شخصیت کی نشو و نما میں حصہ لیا ہے۔ خصوصاً ذاکر صاحب نے آئی۔ سی۔ ایس سے طبیعت ہٹائی اور معلّمی کے وزن و وقار کی طرف مائل کیا۔ اُن کی وجہ سے قوم پرستی کا جذبہ اُبھرا تعلیم کے مقصد کا احساس ہوا، اور علم و اَدب کو زندگی کا خادم بنانے کا ولولہ ہاتھ آیا۔ اقبالؔ سے میں ویسے ہی مُتاثر تھا۔ مگر مجھے اُس زمانے میں بھی غالبؔ، فانیؔ اور حسرتؔ بہت پسند تھے۔ میرؔ کا احترام کرتا تھا، مگر میرؔ کا جادو مجھ پر نہ چل سکا تھا۔

۱۹۲۵ء سے ۱۹۴۵ء کے زمانے میں دو شخصیتوں [۴] سے میں خاص طور پر مُتاثر ہوا۔

---

۱؎ ماہنامہ آج کل، دہلی، جون ۱۹۶۹ء، ص ۱۶

۲؎ ماہنامہ آج کل، دہلی، جون ۱۹۶۹ء، ص ۱۷

۳؎ ذوقِ جنوں، ص: ۱۱ ۴؎ شخصیات اور واقعات، ۲۰-۲۲

ایک مولوی عبدالحق صاحب سے دوسرے ڈاکٹر ضیاء الدین سے۔ مولوی عبدالحق کے ساتھ ۱۹۲۴ء میں ایک ہفتے رہنے کا اتفاق ہوا۔ ڈاکٹر ضیاء الدین اس زمانے میں علی گڑھ کی سب سے اہم شخصیت تھے اور اپنے دادچچی کی وجہ سے علی گڑھ کے وائس چانسلر ہوگئے تھے مجھے انھیں خاصے قریب سے دیکھنے کا اتفاق ہوا اور اسی مطالعے نے مجھ پر یہ حقیقت منکشف کی کہ اگر ہماری تعلیم کا مقصد ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب جیسے لوگ پیدا کرنا ہے تو اس کا کوئی مستقبل نہیں۔

تاثر کا صرف مثبت پہلو عام طور پر دیکھا جاتا ہے اس کا ایک منفی پہلو بھی ہے۔ ڈاکٹر ضیاء الدین کی پوری زندگی، ان کے معیار اور طریقے میرے سامنے تھے۔ میں نے ان سے یہ نتیجہ نکالا کہ اگر تعلیم گاہوں کی قیادت ایسے اشخاص کے ہاتھوں میں رہی تو علم پیترے اور عمل ترکیب کے مترادف ہو جائے گا۔ ڈاکٹر صاحب کے یہاں ہر چیز اپنے اقتدار کے استحکام کی رو سے پرکھی جاتی تھی۔ ان کے نزدیک انگریزی کے استادوں کا مقصد یونیورسٹی کے مہمانوں کے لئے سپاسنامے لکھنا، اور اردو کے استادوں کا مقصد ان کی شان میں قصیدے پڑھنا تھا۔ وہ ابھرتے سورج، چلتی گاڑی کے ماننے والے تھے۔ وہ اپنی دانست میں علی گڑھ اور قوم کی بڑی خدمت کر رہے تھے۔ ان میں بلا کی عملی قوت تھی۔ وہ تھکنا اور مایوس ہونا جانتے ہی نہ تھے۔ مگر ان کے اثر سے استادوں میں علم کی لگن اور طلبہ میں علم کا جذبہ کم ہوگیا۔ اور سب سستی اور سطحی سیاست کا شکار ہوگئے۔ میں نے ان کی زندگی سے یہ سبق سیکھا کہ ایسے اشخاص اور میلانات کے ساتھ کبھی بھولے سے بھی رعایت نہیں کرنا چاہیئے۔ ان کے معاملے میں خاموش رہنا بھی جرم ہے۔

مولوی عبدالحق ان لوگوں میں سے تھے جن کا احترام کئے بغیر کوئی نہیں رہ سکتا۔ انھوں نے تحقیق و تنقید کی دنیا میں کمال پر اکتفا نہیں کی، بلکہ اردو زبان و ادب کی اشاعت اور فروغ کے لئے بھی اپنی زندگی وقف کر دی۔ انھوں نے اس انجمن ترقی اردو کو جو نور

کا ایک چھوٹا سا دیا تھی روشنی کا ایک مینار بنا دیا۔ نوجوانوں سے بڑی محبت کرتے، باوجود پیرانہ سالی کے ادب میں تجربات کے بڑے حامی تھے۔ اچھے مصنفوں کی بڑی ہمت افزائی کرتے، اور غریب طلبہ کی بڑی امداد کرتے۔

انھوں نے ۱۹۲۸ء میں کہا تھا کہ اگر مجھے اپنا جانشین منتخب کرنے کا موقع ملا تو سوائے سرور کے کسی اور کو نہیں لوں گا۔ وہ برابر میرے حال پر شفقت کرتے رہے مگر دہلی آنے کے بعد جس طرح وہ وقتی سیاست کے سیلاب میں اردو کو بھی بہا کر لے گئے، اُس سے میں متفق نہیں ہو سکا۔ میں نے ۱۹۴۸ء میں اُن سے الہ آباد میں کہا تھا کہ مولوی صاحب آپ ہندوستان ہی میں رہئے۔ آپ کے گرد اُردو کی خدمت کرنے والا ایک حلقہ ضرور جمع ہو جائے گا۔ میں نے اپنی خدمات بھی پیش کی تھیں مگر مولوی صاحب نے کہا کہ پاکستان میں کوئی کام کرنے والا نہیں ہے میرا جانا ضروری ہے۔ افسوس ہے وہاں کے لوگوں نے ان کی قدر نہیں کی۔

مولوی عبدالحق صاحب مردم شناس نہیں تھے۔ ان کے گرد بعض ایسے لوگ بھی جمع ہو جاتے جو کام کو ذاتی جاگیر اور تحریک کو اقتدار کا آلہ بنا لیتے۔ مگر مولوی عبدالحق کی محبت سے مجھے اُردو زبان کی خدمت کا ولولہ ملا۔ ان کے خطوط نے میری ہمت افزائی کی۔ میری کتابوں پر تبصروں میں انھوں نے رسمی باتیں نہیں کیں بلکہ ایسی تعریف کی جو آئندہ کاموں کے لئے جوش اور جذبہ پیدا کر دے۔ تعریف کے ساتھ ساتھ وہ میری کمزوریوں پر بھی مناسب الفاظ میں اشارہ کرتے رہے۔ میں نے تنقید میں بے لاگ رائے دینے کا گر اُن سے سیکھا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ کامیاب نہ ہو سکا ہوں۔

٦

## دس برس علی گڑھ سے دُور

۱۹۴۵ء[1] میں ڈاکٹر صاحب کے مشورے سے میں دو سال کے لئے رام پور چلا گیا۔ مگر ڈیڑھ سال کے بعد ہی مجھے لکھنؤ یونیورسٹی میں اُردو کے ریڈر کی جگہ مل گئی، اور اگست ۱۹۴۶ء میں میں نے اپنے نئے عہدے کا چارج لے لیا۔ لکھنؤ میں یونیورسٹی اور شہر کے سب ہی ممتاز لوگوں سے میری ملاقات ہوئی مگر اب سوچتا ہوں تو تین نام ایسے ہیں جن کا ذکر کرنا یہاں ضروری ہے۔ ایک رشید جہاں کا، دوسرا اچاریہ نریندر دیو کا اور تیسرا چیلاپتی راؤ کا۔

رشید جہاں پر اقبال کا یہ شعر ہر طرح سے پسپاں ہوتا ہے:

جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفاں

میں اُن کے والد اور کئی بہنوں کو جانتا تھا مگر ان سے میری ملاقات لکھنؤ میں ہوئی۔ اور بہت جلد ان کے خلوص، ذہانت، گرم جوشی، صاف گوئی اور جذبۂ خدمت کا قائل ہو گیا۔ رشید جہاں بڑی دلکش شخصیت کی مالک تھیں۔ وہ ہر معاملے میں انتہا پسند تھیں۔ ان کے

---

[1] شخصیات اور واقعات، ۲۲-۲۶

یہاں دوست، دشمن کے دو ہی خانے تھے۔ بیچ کا کوئی راستہ نہ تھا وہ بہت جلد خفا ہو جاتیں مگر تھوڑی دیر کے بعد صاف بھی ہو جاتیں۔ ان کے آئینۂ دل میں غبار کا نام نہ تھا۔ وہ بڑی پکی کیمونسٹ تھیں جب زندیوے کے عروج کا زمانہ آیا اور پی سی جوشی نکالے گئے تو مجھے یاد پڑتا ہے کہ میں نے ان سے کہا کہ اس قدر تنگ نظری اور سخت گیری کا اثر پارٹی پر برا پڑے گا، انھوں نے بڑے اعتماد سے کہا نہیں سرور صاحب اچھا ہوا کائی چھٹ گئی۔ ظاہر ہے ان کی رائے غلط تھی مگر وہ اس پر نہایت اعتماد کے ساتھ قائم تھیں۔

میں نے آنند نرائن ملا کے مجموعہ کلام "جوئے شیر" پر دیباچہ لکھا تو ان کی انسان دوستی اور فن کاری کی تعریف کی، رشید جہاں شاعری میں فارمولے کی بہت قائل تھیں۔ انھیں میری یہ تعریف پسند نہ آئی ہم لوگوں میں بحث ہوتی تو دیکھنے والوں کا خیال ہوتا کہ لڑائی ہو گئی، مگر وہ کچھ دیر کے بعد ویسی ہی شگفتہ اور مہربان ہو جاتیں۔

وہ بڑی اچھی دوست اور انتھک کارکن تھیں وہ کسی سے مرعوب ہونے والی نہیں تھیں۔ اپنے مسلک کی خاطر انھوں نے بڑی تکلیف اٹھائی اور بڑی قربانیاں دیں۔ انھوں نے کتنے ہی نوجوان لڑکوں، لڑکیوں کی ہمت افزائی کی اور ان میں لگن، جستجو اور حرارت پیدا کی۔ انھیں ادب سے سچا عشق تھا اور اس کے حیات بخش اور انقلاب آفریں رول کی بڑی قائل تھیں۔

سیاست میں انہماک نے انھیں نہ ڈاکٹری پر پوری توجہ کرنے دی نہ ادب پر۔ انھیں اس کا افسوس بھی تھا۔ انھوں نے جو کچھ لکھا ہے اس سے بہت زیادہ لکھنے کا وہ ولولہ رکھتی تھیں۔ مگر سرطان کے موذی مرض نے انھیں آلیا۔ وہ واقعی ایک شعلہ تھیں تابناک اور روح پرور، افسوس ہے کہ شعلہ بجھ گیا۔ رشید جہاں میں یقین محکم بھی تھا اور عمل پیہم بھی۔ یہ یقین محکم کسی ایک مسلک کا اجارہ نہیں بلکہ جہاں ہو اپنا اثر دکھاتا ہے۔

اچاریہ نریندر دیو دیکھنے میں بڑے منحنی، بیمار اور یونہیں سے آدمی لگتے تھے مگر بڑے

دل و دماغ کے آدمی تھے۔ ان کا سا علم و فضل، تحریر و تقریر کا ملکہ، سیرت کی پاکیزگی اور مزاج کی نرمی بہت کم دیکھنے میں آئی ہے۔ جب وہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہوئے تو انھیں قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ ذاکر صاحب کی طرح وہ بھی مردم شناس نہیں تھے۔ مگر ان میں ذاکر صاحب کی سی لوگوں کو متاثر کرنے اور ان میں کام کا ولولہ پیدا کرنے کی صلاحیت تھی۔ ان کی شخصیت میں بلا کا جادو تھا۔ طلبہ ان کے پرستار تھے۔ اساتذہ کی قوم بڑی کافر قوم ہے، یہ کم کسی پر ایمان لاتی ہے مگر اساتذہ میں بھی ان کا احترام کرنے والے اور ان سے محبت کرنے والے بہت تھے۔

وہ سوشلسٹ پارٹی کے صدر تھے مگر دراصل سیاست کے مرد میدان نہ تھے، وہ تو اس لئے بنے تھے کہ ایک ذہنی تحریک کے قائد ہوں۔ خود تصنیف و تالیف میں مشغول رہیں اور دوسروں کو اس کی طرف مائل کریں۔ دمے کے مرض نے یوں بھی ان کی عملی صلاحیتوں کو کم کر رکھا تھا۔ وہ ہر علمی مسئلے پر ایک سنجیدہ اور متوازن نقطۂ نظر سے سوچتے تھے۔ ہماری مشترک تہذیب کے قائل تھے۔ ہندی کے ممتاز ادیب ہوتے ہوئے بھی اردو ادب کے دلدادہ تھے، اور اردو میں بڑی اچھی تقریر کرتے تھے۔

اچاریہ نریندر دیو سے اکثر سیاسی، سماجی اور تہذیبی مسائل پر باتیں ہوتیں۔ وہ نظریاتی طور پر کھرے سوشلسٹ تھے۔ گاندھی جی کی اخلاقی عظمت کو مانتے تھے مگر گاندھی ازم اور سوشلزم کا ملاپ انھیں پسند نہ تھا۔ بدھ کے فلسفے کے خاصے دلدادہ ہوتے ہوئے بھی سیاسی امور میں وہ مارکس کے نظریات سے انحراف کو غلط سمجھتے تھے مگر کمونزم کو گمراہی سمجھتے تھے۔ اچاریہ نریندر دیو اس چراغ راہ گزر کی طرح تھے جس کے سہارے ہر راہرو کچھ دور بے کھٹکے جا سکتا ہے، مگر بالآخر اپنے گھر کی گلی اسے اپنی فکر کی روشنی کے سہارے طے کرنی پڑتی ہے۔ میرے لئے بھی وہ ایسا ہی ایک چراغ تھے۔

چیلاپتی راؤ سے شاید اردو داں طبقہ کم ہی واقف ہو۔ یہ نیشنل ہیرلڈ کے ایڈیٹر میں

اور کیسے ایڈیٹر جن کی وجہ سے اخبار کی مشرق و مغرب میں آبرو قائم ہے، نہایت کم گو، شرمیلے کچھ بے ہنگم، عورتوں سے خائف رہنے والے، گلا شاید بچپن سے خراب ہے جس کی وجہ سے آواز کبھی صاف نہیں نکلتی۔ خیالات کے اعتبار سے ترقی پسند اور اس سے بعض لوگ انھیں کمیونسٹ کہتے ہیں۔

زندگی، صحافت، ادب، سیاست، سماج میں بلند ترین معیاروں کے نہ صرف قائل ہیں بلکہ ان کو برتتے بھی ہیں انھیں نہ کبھی کسی وزیر کے یہاں کسی نے دیکھا نہ کسی کے دربار میں۔ ان کے اداریے ایسے ہوتے کہ پڑھنے والے بار بار مزے لے کر پڑھتے ہیں اچھی انگریزی، پر مغز اسلوب اور جان دار الفاظ کے ساتھ ظرافت کی ایک چاشنی ان کا امتیاز ہے۔ بڑے سچے۔ سیدھے اور وضع دار آدمی ہیں۔ ایسا بے تعصب اور کھلے دل کا آدمی میری نظر سے کم گزرا ہے۔

لیڈروں میں وہ صرف لال جواہر نہرو اور مرحوم رفیع احمد قدوائی کے قائل ہیں مگر ان کی نکتہ چینی سے یہ لوگ بھی نہیں بچے۔ جب تک چیلاپتی راؤ جیسے لوگ اخبار نکالتے رہیں گے ریاکاری، منافقت، سیاسی بازی گری، تلمع سازی کا پردہ فاش ہوتا رہے گا۔ چیلاپتی راؤ نے اپنے اخبار کو ایک تہذیبی ادارہ بنا دیا ہے۔ یہ ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ جب گورنر کے۔ ایم منشی نے یونیورسٹیوں کے اندرونی معاملات میں مداخلت کی تو چیلاپتی راؤ سینہ سپر ہوئے۔ ایسے ایسے خوب صورت اداریے لکھے کہ منشی کے خوب صورت الفاظ کا طلسم ٹوٹ گیا۔ احیاء پرستی، تنگ نظری، تعصب، بد دیانتی، فرعونیت پر چیلاپتی راؤ ہمیشہ وار کرتے رہے۔ اور ان کا وار کبھی اوچھا نہیں پڑا۔"

جب[1] میں لکھنؤ میں تھا تو مولوی عبدالحق کی سفارش پر بنیر میرے علم کے میرا تقرر

---

[1] ماہنامہ آج کل، دہلی، جون ۱۹۶۹ء ص ۱۷۔

کراچی یونیورسٹی میں پروفیسر کے عہدے پر ہو گیا تھا۔ میں کچھ تذبذب میں تھا۔ ذاکر صاحب سے رائے لی تو انھوں نے صرف اتنا کہا کہ اگر آپ کا واقعی جی چاہتا ہے تو ضرور جائیے، مگر میں جانتا ہوں کہ آپ وہاں خوش نہ رہیں گے۔ آپ کی اصلی جگہ یہیں ہے۔ میری آنکھوں سے پردہ سا چھٹ گیا اور میں اور استقلال سے اپنے گھر میں جم گیا۔ میری طرح ہزاروں ایسے ہوں گے جنھیں ذاکر صاحب نے اعتماد و افکار سے مالا مال کیا..... ذاکر صاحب کا تذکرہ کافی نہیں ہے، اُن کی تقلید ضروری ہے۔

○

[پروفیسر آل احمد سرور، کوئی دس برس کے "تیاگ" کے بعد، دسمبر ۱۹۵۵ء میں سید حسین ریسرچ پروفیسر کی حیثیت سے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے شعبۂ اُردو میں واپس آئے، اپریل ۱۹۵۸ء میں پروفیسر رشید احمد صدیقی ریٹائر ہوئے تو سرور صاحب نے اُن کی جگہ شعبۂ اُردو کی صدارت سنبھالی اور مارچ ۱۹۷۴ء تک اس خدمت پر مامور رہے۔]

rekhta

(۷)

---

## کچھ اہم واقعات

میں[1] نے ابھی تک اشخاص کا ذکر کیا ہے ان واقعات کا نہیں جن سے میں متاثر ہوا ہوں۔ چند واقعات خاص طور سے یاد آتے ہیں جن میں ایک ہیروشیما پر ایٹم بم گرنے کا واقعہ ہے۔ دوسری جنگِ عظیم کا اثر اتنا بڑا اور پھیلا ہوا تھا کہ جنگ سے تنفر کے سوا اور کوئی جذبہ میں اپنے میں نہ پا سکا۔ مگر ہیروشیما کے تباہ ہونے سے میری روح لرز گئی۔ اکثر خیال آیا کہ لڑائی میں لاکھوں کروڑوں جانیں، انسانیت کے کتنے ہی اقدار، تہذیب کے کتنے ہی خزانے، حسن و عشق کے اَن گنت کرشمے، چند حکمرانوں کی ضد یا نفرت یا خوف کی وجہ سے برباد ہو سکتے ہیں۔ مگر پچھلی لڑائیوں اور اس لڑائی میں یہ فرق کتنا بھیانک ہے کہ صرف لڑنے والے ہی نہیں معصوم عورتیں اور بچے، فن کار، سائنس دان، مزدور، عاشق، باپ، بھائی، ماں، بہن کی زندگی کے وہ نازک اور ریشمی تانے بانے اس طرح آنِ واحد میں ٹوٹ جاتے ہیں اور بھری بستیوں اور جگمگاتی شاہراہوں کی جگہ راکھ کا ڈھیر رہ جاتا ہے۔ میرا ایمان ہے کہ اس ظلم کو صرف انسانیت کی اعلیٰ اقدار

---

[1] شخصیات اور واقعات، ۲۶

ہی روک سکتی ہیں، اور وہ بھی اس وقت جب دُنیا کے تمام انسانوں کا ضمیر بیدار ہو جائے۔

دوسرا واقعہ[1] جس نے مجھے برسوں مضمحل، افسردہ، زخمی اور ملول رکھا وہ تقسیم ملک کے فسادات کا ہولناک سلسلہ تھا۔ رفتہ رفتہ حالات پر قابو پا لیا گیا، اور اب کچھ لوگ بھولنے جا رہے ہیں کہ ہندوستان میں (۱۹۴۷ء میں) کس طرح تہذیب اور انسانیت کا جنازہ نکلا تھا۔ کس طرح عورتوں کی بے آبروئی ہوئی تھی، کس طرح بچوں کو ایذائیں دے کر ہلاک کیا گیا تھا۔ کس طرح خاندان کے خاندان اور گاؤں کے گاؤں تباہ کر دیئے گئے تھے۔ لوگ کہتے ہیں کہ وقت ہر زخم کو مندمل کر دیتا ہے کچھ لوگ کہتے ہیں کہ صرف مغربی سیاست یا فرقہ واریت کو الزام دینے سے ان کی روح کا بوجھ ہلکا ہو سکتا ہے، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ عام طور پر ہم ہندوستانی ابھی تک اوپری دل سے انسانیت اور تہذیب کا نام لیتے ہیں۔ ہماری امن پسندی بھی ان کا ایک پردہ ہے۔

ہمارے دلوں میں صدیوں کی نفسیاتی گرہیں ہیں۔ ہندو، مسلمان، شیعہ، سُنّی، برہمن، ٹھاکر، بنیے، بنگالی، پنجابی اب تک کتنے ہی خانے ہمارے دلوں کو تقسیم کئے ہوئے ہیں۔ ہم کسی کے ڈنڈے کے خوف سے خاموش تھے۔ جیسے ہی ڈنڈے کا خوف ختم ہوا ہماری اصلیت بے نقاب ہو گئی۔ اس اصلیت کو آج بھی نظر انداز کرنا جرم ہوگا۔ ابھی یہ پھر بے نقاب ہو سکتی ہے۔ یہ مرض چند سالوں میں جانے والا بھی نہیں ہے اس کے لئے بہت مغموس اور خاموش اقدام کرنے ہوں گے۔

ایک[2] اور واقعہ جس کا مجھ پر ابھی تک اثر ہے مولانا ابوالکلام آزاد کی موت ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ مولانا آزاد سے ادھر دس برس میں کئی دفعہ ملاقات ہوئی۔ انجمن اور ساہتیہ اکادمی کے کاموں کے سلسلہ میں تبادلۂ خیالات ہوا۔ ان کی آخری تقریر بھی اردو کانفرنس

---

[1] شخصیات اور واقعات، ص ۲۷

[2] شخصیات اور واقعات، ۲۹

میں سنی، مگر ان کی زندگی کا وہ اثر میرے اوپر نہیں جو ان کی موت کا ہے۔

میں اتفاق سے اُس دن دہلی میں موجود تھا اور جب وہ نزاع کے عالم میں تھے، اس وقت بہت سے غمزدہ اشخاص کے ساتھ میں بھی دوسرے کمرے میں موجود تھا، پھر میں ان کے جنازے میں شریک ہوا، وہ منظر میں ساری عمر نہیں بھول سکتا۔ ہم ہندوستانی فطرتاً تماشائی ہیں اور غالب کے اس شعر پر اکثر عمل کرتے ہیں:

اک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق
نوحۂ غم ہی سہی نغمۂ شادی نہ سہی

مولانا آزاد کا جنازہ دیکھنے کے لئے جو ہجوم اُبل پڑا تھا اس میں تماشائی بھی تھے اور اہلِ نظر بھی۔ یہ ہجوم بذاتِ خود ایک شاندار زندگی کی تکمیل، ایک پرشکوہ داستان کا تتمہ، ایک المیہ کا وہ آخری سین تھا جب آنسو خشک ہوجاتے ہیں مگر دل میں ایک کسک بیدار ہوجاتی ہے۔

۱۹۵۸ء کا ایک واقعہ[1] ہے جس نے مجھے بُری طرح چونکا دیا ہے۔ یہ ہے نہرو کی کچھ عرصے کے لئے حکومت سے علیحدگی کی خواہش۔ گو یار لوگوں کی خوشامد نے جواہر لال نہرو کو بالآخر اس ارادے سے باز رکھا، مگر مسئلہ جوں کا توں موجود ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا نہرو کی بنائی ہوئی عمارت اتنی مضبوط بنیادوں پر قائم ہے کہ وہ آئے دن کی آندھیوں کا مقابلہ کر سکے؟ کیا جمہوریت دلوں میں جاگزیں ہوگئی ہے؟ کیا قومیت کے نشے سے سب سرشار ہیں۔ کیا لسانی سامراج کا خطرہ ٹل گیا ہے؟ کیا ہمارا نظمِ حکومت، دیانت، عدل اور فرض شناسی کا علمبردار ہے؟ کیا اُردو اور دوسری قومی زبانوں کے ساتھ انصاف کا جذبہ عام ہے؟ کیا اقلیتوں کی تہذیب کے پامال ہوجانے کا امکان ختم ہوچکا ہے؟ اگر ایسا نہیں ہوا تو اب تک کیوں نہیں ہوا۔۔۔؟؟

---

۱؎ شخصیات اور واقعات، ص ۲۱

بظاہر[1] ادب کے ایک طالب علم کے لئے جس کا عملی سیاست سے کوئی براہِ راست تعلق نہ ہو، یہ اندیشہ ہائے دور دراز بے معنی ہیں مگر میں تو ادب کو ایک تہذیبی پس منظر میں اور تہذیب کو سماجی تبدیلیوں کے دائرے میں دیکھتا ہوں۔ مجھے ادب کے جمالیاتی پہلو کا پورا پورا احساس ہے مگر اس کے اخلاقی اور سماجی پہلو سے انکار نہیں کر سکتا۔

میں جب ہندوستان میں اُردو کے مستقبل پر غور کرتا ہوں تو صاف نظر آتا ہے کہ یہ مستقبل جمہوریت کے فروغ، قومیت کے استحکام اور مشترک تہذیب کے عام ہونے سے وابستہ ہے۔ اس مقدس کام میں اردو والے مدد کر سکتے ہیں۔ مگر ان کا سرانجام یا صرف ان کے اختیار میں نہیں ہے۔ ہاں یہ امید ضرور ہے کہ اگر وہ جدید ہندوستان کی تعمیر میں تن من دھن سے لگ جائیں گے تو ان کا ہی نہیں پورے ملک کا فائدہ ہوگا۔ کرنیں پامال ہو سکتی ہیں برباد نہیں ہو سکتیں اور نقش کبھی کبھار مٹ مٹ کر سنورتے ہیں۔

گاندھی جی کے فلسفے سے میں کبھی پوری طرح متفق نہیں ہو سکا۔ مجھے ہمیشہ یہ احساس رہا کہ اُن کی نیک نیتی اور خلوص کے باوجود اُن کے نسخے میں ہمارے درد کا مکمل علاج نہیں ہے۔ مگر گاندھی جی کی اخلاقی عظمت سے کون انکار کر سکتا ہے۔ پھر گاندھی جی نے جس طرح اپنی موت کا راستہ پسند کیا اور مجھے یقین ہے کہ گاندھی جی جب آخری عمر میں یہ راستہ اختیار کر رہے تھے تو جانتے تھے کہ اس کا انجام کیا ہوگا اور جس طرح اپنے ہم وطنوں کو یہ احساس دلایا کہ ظلم کسی کے ساتھ ہو سارے ملک پر ظلم ہے، اور ملک کے ساتھ انصاف کا دعویٰ اسی وقت درست ہو سکتا ہے جب اس کی ہر اقلیت کے ساتھ انصاف کیا جائے، اسے اور کوئی فراموش کر دے، اقلیتیں کبھی فراموش نہیں کر سکتیں میں تو اسے کبھی بھول نہیں سکتا۔ جب میں اس واقعہ کو یاد کرتا ہوں تو احسان کا جذبہ کم اُبھرتا ہے فخر کا زیادہ۔

ہماری قوم ابھی پستی کی حالت میں ہے۔ ابھی اس کا قومی کردار نہیں بنا۔ جمہوریت اور

---

[1] شخصیات اور واقعات، ص ۳۲-۳۴

مساوات کے تخیل سے وہ کام لیتی ہے اس پر اس کا ایمان نہیں ہے۔ ابھی وہ سستی فتح کے تیز و تند نشے میں گرفتار ہے مگر اس کے کروڑوں افراد میں ایسے لوگ بھی کم نہیں ہیں جو بلند نگاہ، پر سوز شخصیت اور دلنواز سخن رکھتے ہیں۔ اس لئے آج جب شباب کی آندھی ختم ہو چکی ہے اور میری عمر کا (اٹھترواں) سال چل رہا ہے اور دل میں بہت سے زخم اور درد میں محبت کی خراشیں ہیں پھر بھی میں مایوس نہیں ہوں اور سمجھتا ہوں کہ شاید کچھ اور ٹھوکریں کھا کر، اور کچھ دکھ جھیل کر، ہمارا قومی کارواں ضرور اس منزل کی طرف گامزن ہوگا جو ہمارا مقدر ہے اور ہم اپنے دیس میں ذہنی آزادی، سماجی انصاف اور مادی خوشحالی کی جنت بنا سکیں گے۔

ہاں یہ جانتا ہوں کہ یہ کام آج کے سیاسی شعبدہ بازی سے نہیں بلکہ ادیبوں، دانشوروں، سائنس دانوں، معلموں اور فن کاروں کی اس متحدہ کوشش سے انجام پائے گا جو نعروں سے نہیں بلکہ خونِ جگر سے وجود میں آتی ہے، اور جس کے لئے صرف مشرق یا صرف مغرب، صرف قدیم یا جدید نہیں بلکہ انسانیت کی پوری تاریخ اور تہذیب کی پوری تصویر کام آئے گی۔ رہا میں تو، میں نے اب تک جو کچھ سیکھا ہے اس کا ماحصل یہی ہے کہ عاشق ہونا کافی نہیں، عارف ہونا بھی ضروری ہے۔ عشق بے صبر ہوتا ہے۔ عرفانِ حقیقت کے علم کی وجہ سے بے صبری کا شکار نہیں ہوتا۔ عاشق بیج بوتے ہی لہلہاتی ہوئی کھیتی کا تصور کرنے لگتا ہے پھر مایوس ہو جاتا ہے۔ عارف جانتا ہے کہ کھیتی کو کھلیان بننے میں کتنے مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے شخصیت کا حسن، ذہانت کی چمک دمک میں نہیں، کردار کی استواری اور مضبوطی میں ہے جو زندہ اور توانا خیالات سے آتی ہے۔ چھوٹے راستے خطرناک ہیں۔ خدمت بالآخر اپنا حق منوا لیتی ہے ۔۔۔

ادب سب سے اچھا نشہ ہے کیونکہ اس میں نجات کا سامان بھی ہے، اور ہم میں سے بیشتر صرف دراصل اپنے عاشق ہیں اس لئے میر کا یہ شعر ہم سب کے لئے بصیرت افروز ہے

اے آہوانِ کعبہ نہ اُمنڈو حرم کے گرد
کھاؤ کسی کا تیر، کسی کا شکار ہو!

میں اپنے زخموں کے کائنات پر شرمندگی محسوس نہیں کرتا کیونکہ بقول غالب:

ہر سنگ و خشت ہے صدف گوہر شکست
نقصاں نہیں جنوں سے جو سودا کرے کوئی

۲۵۔ اپریل (۱۹۶۰ء) کو ایک ہنگامہ[۱] (علی گڑھ میں) ہوا، اُس میں یونین ہال کے اندر میرے سر میں ایک اینٹ لگی۔ اس کے بعد جب وہاں پتھراؤ ناقابلِ برداشت ہو گیا تو میں نے وہاں سے کچھ لوگوں کے ساتھ ایس ایس ہال ڈائننگ ہال میں پناہ لی تھوڑی دیر کے بعد پھر وہاں سے نکلا تو کچھ لڑکوں نے مجھ پر حملہ کیا اور ڈنڈوں اور اینٹوں سے تواضع کی جس کی وجہ سے سَر اور شانے میں چوٹیں آئیں اور بائیں ہاتھ کی چھوٹی اُنگلی کی ہڈی ٹوٹ گئی.... علاوہ جسمانی چوٹوں کے طلباء کی اس دیوانگی کا اعصاب پر بھی گہرا اثر (پڑا)۔

مَیں بھی[۲] ایک طالب علم ہوں اور اس لفظ میں وہ شان محسوس کرتا ہوں جو بڑی بڑی چیزوں میں نہیں، علم کی پیاس سے بڑھ کر کوئی پیاس نہیں۔ علم محض روزی کمانے کا ذریعہ نہیں، انسانیت، تہذیب، زندگی، ادب سب کا سہارا ہے۔ موجودہ اقتصادی حالات نے علم کو محض ایک آلہ، ایک ناخوشگوار راستہ، ایک ضروری مگر بھاری بوجھ بنا رکھا ہے۔ اس میں سارا قصور اقتصادی حالات کا ہی نہیں، ہمارے نظامِ تعلیم کا بھی ہے جو اگرچہ اَدبی کہا جاتا ہے مگر صحیح معنوں میں ادبی نہیں ہے۔ اگر یہ صحیح معنی میں اَدبی ہوتا تو اس میں سائنس اور جدید علوم سے اتنی بیزاری نہ ہوتی اور نہ یہ اتنی خود غرضی، نفسانیت، تنگ نظری اور گروہ بندی سکھاتا۔

---

[۱] مکتوب آلِ احمد سرور، ۹۔ مئی ۱۹۶۰ء بنام: نادم سیتاپوری، نقوش، لاہور خطوط نمبر ۲، صفحہ ۲۵۲
[۲] تنقید کیا ہے، ۱۳۹

میں[1] (طلباء) سے درخواست کروں گا کہ (وہ) اپنی علمی جدوجہد کو محض کالج کی چاردیواری تک محدود نہ رکھیں بلکہ اپنی ساری زندگی میں اسے جاری وساری رہنے دیں۔ اچھا شہری اور اچھا فرد وہ ہے جو ہمیشہ اپنے آپ کو بہتر بنانے کی کوشش میں لگا رہے مگر جو اپنی بہتری کو اپنے حلقے اور اپنے ملک وقوم کی بہتری سے علیٰحدہ نہیں بلکہ ہم آہنگ سمجھے۔

ابھی[2] میری جاننے، دیکھنے بھالنے، سیکھنے، سمجھنے کی خواہش مردہ نہیں ہوئی ہے۔ مجھے مختلف گھوڑوں اور علمی اداروں کے خصوصیات اور رجحانات سے گہری دلچسپی ہے۔ ایک معلّم اور ادب کے خادم کی حیثیت سے مجھے یہ فکر رہتی ہے کہ طلباء کی ذہنی کیفیات کا اندازہ کروں اور اساتذہ میں زندہ رہنے اور زندہ رکھنے کی صلاحیت کا جائزہ لوں۔

آپ کا[3] علم اگر آپ کو عوام سے دُور رکھتا ہے، اُن کے دُکھ درد کا شریک نہیں بناتا، آپ میں ایک احساسِ برتری پیدا کرتا ہے تو یہ راستہ آپ کو ابلیس کی طرف لے جاتا ہے .... اور اگر اس سے آپ میں اپنے گرد وپیش کی زندگی کو بہتر بنانے کی خواہش ایک مقدس جذبہ بن کر جاگ اُٹھتی ہے ... تو یہ بڑی بات ہے، پھر آپ علم اور زندگی کے صحیح رشتے کو سمجھ جائیں گے۔

---

[1] تنقید کیا ہے، ۱۲۹

[2] تنقید کیا ہے، ۱۱۰

[3] تنقید کیا ہے، ۱۴۰

٨

# میری کچھ پسندیدہ کہانیاں

rekhta

کہانیاں[1] مجھے پسند ہیں، کسے نہیں ہوتیں مگر ہر قسم کی کہانیاں نہیں۔ آخر طوطا کہانی، بکٹ کہانی، چھبیلی بھٹیاری کی کہانیاں بھی تو ہیں۔ پھر "نادان خدا پرست اور دانا دنیا دار" کی کہانی بھی لکھی گئی ہے اور ایسی کہانیاں بھی جو بقول مصنف "تحلیلِ نفسی" کے اصول پر ترتیب دی گئی ہیں۔ خارستان اور گلستان، نسرین نوش اور خارا، سائیکی، غزالہ، ریحانہ نوشابہ، جمالی، شہاب جیسے ناموں اور کارناموں سے مجھے زیادہ دلچسپی نہیں۔

یہ بات نہیں کہ حسین عورتوں، جگمگاتے زیوروں، پُر اسرار شخصیتوں، جذباتی آثار چڑھاؤ، شاعرانہ فضا سے مجھے لگاؤ نہیں ہے اور بہت ہے۔ مگر پھر بھی کہانی پڑھتے وقت، میں دھوکہ کھانا چاہتا ہوں، اور نہ دوسرے کی آنکھ میں خاک جھونکنا پسند کرتا ہوں، میں کہانی، کہانی کی طرح پڑھتا ہوں، اس میں مضمون کا لطف، شعر کی رنگینی، فلسفے کی گہرائی ڈھونڈتا اور پاتا ہوں مگر افسانے کو شعر یا فلسفہ نہیں بنانا چاہتا مجھے نقاب پوش اشخاص ہی نہیں، نقاب پوش اسالیب سے بھی کچھ چڑ سی ہے۔ میں دوسرے کے کندھے پر رکھ کر بندوق چھوڑنے یا پیچھے

---

[1] تنقیدی اشارے، ۲۴۲ – ۲۴۵

سے وار کرنے کو بہت اچھا نہیں سمجھتا۔ قصّے کہانیاں اس لئے پڑھتا ہوں کہ ان میں لطف محسوس کرتا ہوں، کچھ کھوتا ہوں کچھ پاتا ہوں اور افسانے میں کسی کو بنتے بگڑتے دیکھ کر خود بھی بنتا بگڑتا ہوں۔ اچھے افسانے سے میرا زندگی کا علم کچھ بڑھ جاتا ہے، تجربہ کچھ گہرا ہو جاتا ہے، انسانوں کی فطرت، اُن کے اُتار چڑھاؤ کچھ سمجھ میں آنے لگتے ہیں۔ افسانہ وہ فریب ہے جو حقیقت کو کچھ اور روشن کر دیتا ہے، وہ جھوٹ ہے جو بغیر سچ کی مدد کے خوبصورت نہیں معلوم ہوتا۔ افسانہ پڑھنا میں ایک دلچسپ مشغلہ سمجھتا ہوں، عبادت نہیں تصور کرتا، اگرچہ میں نے سنا ہے کہ مومن کا ہر کام عبادت ہے۔

قبل اس کے کہ میں آپ کو یہ بتاؤں کہ مجھے کونسی کہانیاں پسند ہیں یہ کہنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ میری پسند بدلتی رہتی ہے اور غالباً یہ عمل آپ کے ساتھ بھی ہوتا ہوگا۔ پہلے مجھے وہ کہانیاں پسند تھیں جو یا تو بڑی بوڑھیاں سناتی تھیں، یا نول کشور پریس کی بادامی کاغذ والی کتابوں میں ملتی تھیں، مجھے اس وقت اس سے سروکار رہتا کہ پھر کیا ہوا؟ کیوں اور کیسے سے غرض نہ تھی۔ انار توڑو تو پریاں کیوں نکلتی ہیں اور کسی تالاب میں کودو تو پرستان میں کیسے پہنچ جاتے ہیں؟ یہ باتیں غیر متعلق تھیں، جب تک ہم کہانی کہنے والے کی جادو کی چھڑی سے پرستان میں فوراً پہنچ سکتے تھے۔ چنانچہ ان کہانیوں میں ایک شہزادہ جسے صرف تین سمتوں میں جانے کی اجازت تھی چوتھی سمت سفر کرتا تھا ورنہ کہانی کیسے چلتی۔ پھر اسے ایک شہزادی ملتی تھی مگر وہ ایک خون کے دریا میں نہا کر اس کو حاصل کر پاتا تھا۔ غرض شہزادے کی بہادری، شہزادی کا حسن، خون کا دریا اور سہرے کے پھول، یہ ان کہانیوں کے محور تھے۔ ان کاغذی پھولوں کو میں سب کچھ سمجھتا تھا۔ ان کا جادو مجھے اب تک بھولا نہیں ہے پھر وہ زمانہ آیا جب کیوپڈ اور سائیکی، خارستان اور گلستان اور کہکشاں کا ایک ساحر، اچھے معلوم ہونے لگے۔ انہیں پڑھ کے دل کی لگی بجھتی بھی تھی اور بھڑکتی بھی تھی۔ یہ افسانے نہ تھے، اچھے خاصے "نیم برہنہ رقص" تھے، معلوم نہیں ان سے روح بیدار ہوتی تھی یا نہیں

بدن ضرور بیدار ہوتا تھا، گو چہ خفتہ چہ بیدار، یہ زمانہ بھی گزر ہی گیا۔

پھر نہ معلوم کیسے میں نے پریم چند کی کہانیاں پڑھیں اور مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی پس و پیش نہیں کہ مجھے شروع میں یہ بُری معلوم ہوئیں، کچھ پھیکی سیٹھی سی، کچھ بے جان سی، ان میں نہ تو کسی کا ملکوتی حسن ہوتا تھا جس کی خاطر آدمی شعر پڑھے اور مر جائے اور نہ ہیرو کے ایسے کارنامے جو ہم جیسے معمولی، کمزور، پراگندہ دل اشخاص سے سرزد نہ ہو سکیں۔ ان میں کبھی کوئی کسان ہوتا، کبھی کوئی سیٹھ ساہوکار، کبھی کوئی راجپوت سردار یا کوئی غریب برہمن، کوئی ماما ہوتی یا کوئی چمارن جس کی بپتا پر ترس آتا اور تھوڑی سی جھنجھلاہٹ کر گئے تھے نماز بخشوانے، اُلٹے روزے گلے پڑ گئے یعنی خیال تو یہ تھا کہ قصہ پڑھ کر لطف اٹھائیں گے اور اس کے بجائے ملی ایسی گریہ زاری اور دُکھ بھری داستان جس کی وجہ سے اچھا خاصا موڈ خراب ہو جائے مگر رفتہ رفتہ کچھ شعور آیا، نئے احساس اور نئے ذہن نے کایا پلٹ دی، زمانہ کے حالات، انگریزی ادب کے مطالعے ان کی برکتوں اور نعمتوں نے ذوق میں تبدیلی پیدا کی، شیرینی میں تلخی کا احساس ہوا، تلخی شیرینی بن گئی۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے۔

پریم چند کے افسانوں نے رفتہ رفتہ اور سب افسانوں کی یاد دل سے محو کر دی۔ حج اکبر میں مزا ملنے لگا۔ دو بیل بار بار یاد آئے، نجات کا تصوّر رہنے لگا۔ برات، شطرنج، بڑے بھائی، شکوہ شکایت، نئی بیوی، کفن پڑھے اور پھر پڑھنے کو جی چاہا۔ اوروں کے نزدیک ان کی زبان غلط ہے، اُن کے مکالمے بالکل فطری نہیں۔ ان کے کردار جذبات کی پوٹ ہیں۔ ان کی سب دیہاتی عورتیں دیویاں اور سب دیہاتی مرد دیوتا، ان کی محبت فرشتوں کی سی ہے یا بچوں کی سی، اور ان کے افسانے صحیح معنوں میں کئی افسانوں کی لڑیاں ہیں یہ سب صحیح ہے مجھے پریم چند کی اور بھی کئی خامیوں کا احساس ہے مگر مجھے ان کے افسانوں میں جیتے جاگتے انسان اور جانی پہچانی زندگی ملتی ہے وہ فطرت کی حسین گود بھی دیکھ

لیتے ہیں اور اس میں بدصورت انسانیت بھی اور بڑی بات یہ ہے کہ پریم چند میں اس بدصورت انسانیت سے محبت اور اسے حسین اور مقدس و پاکیزہ بنانے کی خواہش بھی ہے۔ بظاہر پریم چند کی کہانیاں پروپیگنڈا ہیں اس لئے کہ زندگی خود پروپیگنڈا ہے مگر پریم چند کو لرج کے بوڑھے بحری کی طرح ہمارا دامن پکڑ کر نہیں بیٹھ جاتے۔ وہ ایک اچھے اور خاموش رفیق ہیں اور ذہن پر ایک خوشگوار اثر چھوڑ جاتے ہیں۔

اپنی بات واضح کرنے کے لئے میں پریم چند کی ایک کہانی کا خاص طور سے ذکر کرنا چاہتا ہوں جو مجھے بہت پسند ہے اس کا نام ہے "کفن"۔ یہ دو ایسے چماروں کی کہانی ہے جن کی دین و دنیا دونوں چوپٹ ہیں۔ ایک باپ ہے، دوسرا بیٹا، بھوک کے مارے گرے پڑے آلو چن کر الاؤ میں بھون کر کھا رہے ہیں بیٹے کی جوان بہو کوٹھری کے اندر درد زہ میں تڑپ رہی مگر اس دُور کے مارے اُسے دیکھنے اندر نہیں جاتا کہ کہیں باپ سب آلو نہ کھا جائے۔ وہ بیچاری تڑپ تڑپ کر ٹھنڈی ہو جاتی ہے مگر انھیں خبر نہیں ہوتی، صبح کو وہ روتے پیٹتے زمیندار کے پاس چلے جاتے ہیں جو کفن دفن کے لئے کچھ روپے دے دیتا ہے مگر یہ بھوکے، ننگے بے حیا باپ بیٹا سب روپے شراب و کباب میں اُڑا دیتے ہیں۔ کوئی اچھی بات نہیں ہے مگر زندگی میں صرف وہی باتیں نہیں ہوتیں جو ہم چاہتے ہیں یا جنہیں ہم اچھا سمجھتے ہیں۔ پریم چند زندگی سے اتنے سستے مفاہمے پر راضی نہیں کہ وہ اسے پھولوں کی سیج ہی بنا کر پیش کریں۔ یہ ہونا چاہیئے یا کاش ایسا ہوتا، جیسے خیالوں میں مست رہنے کے بجائے پریم چند مردانہ وار یہ بتاتے ہیں کہ دیکھو یوں بھی ہوتا ہے زمانے میں۔ ہم اپنے سماج کے زخموں اور ناسوروں سے اپنی جہالت اور گندگی سے منہ چھپا کر بیٹھنا چاہتے ہیں مگر پریم چند ہماری خلوتوں اور پناہ گاہوں میں گھس کر ہمارے دلوں پر کچوکے لگاتے ہیں، اپنا اپنا طریقہ ہے۔ کوئی بدبو سے بچنے کے لئے عطر میں ڈوبا ہوا رومال ناک پر رکھ لیتا ہے، کوئی اس کا احساس عام کر کے اُسے دُور کرنا چاہتا ہے پریم چند کے ہاتھوں

میں افسانۂ عطر میں ڈوبا ہوا ریشمی رومال نہیں رہا، پرچم، جھنڈا یا نشان بن گیا۔

ان کی آواز میں ایک ایسا سوز و گداز تھا کہ ان کی ہمنوائی کے لئے ایک اچھا خاصا حلقہ پیدا ہو گیا ہے۔ جنگ عظیم کے بعد سے افسانہ نگاری کو بڑی ترقی حاصل ہوئی ہے اور خصوصاً گذشتہ پندرہ سال میں نوجوانوں نے اس ترقی میں بڑا حصہ لیا ہے۔ افسانوی ادب کی مقبولیت بعض کے نزدیک علمی تہی مائگی کی دلیل ہے حالانکہ یہ دلیل کم مائگی کی ہے، تہی مائگی کی نہیں۔ اچھا افسانوی سرمایہ ادبی دولت ہے مگر یہ دولت ہر کام میں نہیں لگائی جاسکتی جس طرح ایک شاعر سے یہ اُمید نہ رکھنی چاہیئے کہ وہ اپنے ایک ہی شعر سے تجربہ گاہ اور کارخانے کی ریاضت سے قوم کو بے نیاز کر دے گا۔ اسی طرح افسانہ نگاری کے بوئے ہوئے بیجوں سے بہت جلد فصل کاٹنے کی امید نہ رکھنی چاہیئے۔ ان بیجوں اور ان کی کھیتی کو میں چند مثالوں سے واضح کروں گا۔

کرشن چندر کی ایک کہانی ہے "بے رنگ و بو" آپ کہیں گے لوگوں کو رنگ و بو پسند ہوتے ہیں لیکن یہ بے رنگ و بو کیوں پسند ہے سُنیئے، اس میں ذکر ہے ایک طالب علم کا جو کرایہ کا مکان تلاش کرتا ہے، مگر اسے کامیابی نہیں ہوتی، پہلے پہلے وہ ایک سکھ دوکاندار اور اس کی بیوی سے دوچار ہوتا ہے دوکاندار کو کھانسی ہے اور اس کی زرد رو بیوی کی دھوتی کا ایک گوشہ ایک بچہ پکڑے روئے جاتا ہے۔ دوسرا گود میں اُٹھائے ہوئے ہے۔ تیسرا اس کے پیٹ میں ہے، وہاں سے گھبرا کر آگے بڑھتا ہے تو ایک دوسرا منظر سامنے آتا ہے کہ ایک بابو صاحب ہیں جو صرف اسی کو شریف سمجھتے ہیں جس کی بیوی اور بچے ہیں، اور جس مرد کے پاس عورت نہیں اس کی نہ تو نگتی ہو سکتی ہے اور نہ اُسے کوئی مکان کرایہ پر مل سکتا ہے۔ وہ اور آگے بڑھتا ہے اور اب کی بار مکان کی مالکہ کے ساتھ ایک عورت بھی نظر آتی ہے جس کی زندگی اس وجہ سے پھیکی اور بے رنگ و بو ہے کہ اس کا شوہر دن بھر دفتر میں گزارتا ہے وہ آگے بڑھتا ہے تو ایک مزدور ملتا ہے جو یہ دریافت کرنے پر کہ

بیوی ہے ، ہنستے ہوئے جواب دیتا ہے" جی سرکار" کیا ہوا اگر وہ غلام ہے کم ازکم اس کا بھی تو ایک غلام ہے ۔ اور شام کو یہ طالب علم اسی طرح واپس ہوسٹل پہنچ جاتا ہے ۔ جہاں راج ہنس اور انقلاب کی چیخ و پکار ہے اور ساگ ، دال اور کاشی پھل مگر ٹھہریے یہ بات کیا ہوئی ۔ کرشن چندر نے اس چھوٹے سے افسانے میں ہندوستان کے متوسط طبقے کی زندگی کا ایک سچا نقشہ پیش کیا ہے ۔ اس کی تصویریں بظاہر ایک دوسرے سے بالکل علیحدہ ہوتی ہیں مگر دراصل ان میں ایک خاص ترتیب ضرور ہوتی ہے ، یہ نوجوان افسانہ نویس خوبصورتی اور غریبی سے بہت متاثر ہوا ہے اور خوبصورتی کو عام کرنے اور غریبی کو کھودینے کی کوشش میں اپنے طور پر مصروف ہے ۔

اس کی ایک اور کہانی کا نام ہے" زندگی کے موڑ پر" یہ ذرا طویل افسانہ ہے ۔ ایک ہے شری پرکاش ــــ وہ اپنے بہنوں کو لے کر اپنی ایک رشتے کی بہن پرکاش وتی کی شادی میں سری پور ایک قصبے میں جاتا ہے ، پرکاش اس کی بہن لیلا اور سوشیلا ' لاری کے مسافر وہ جاٹ عورت جس کی آنکھیں دو ستاروں کی طرح روشن تھیں پھر سری پور کے عمائدین پٹواری اور اسکول ماسٹر ' دولہن جسے ادب سے ذوق تھا اور جو بی ۔ اے کرنا چاہتی تھی مگر جس کی شادی ایک ہلدی بیچنے والے سوداگر کے لڑکے سے ہو رہی تھی اور جو یہ کہہ کر اپنے آپ کو تسلی دے رہی تھی کہ کوئی پر پھڑ پھڑائے بھی تو اڑ کر کہاں جائے ۔ اس کے ہاتھ میں ایک لکیر شاعری کی بھی تھی مگر شاعری کا آبگینہ ہلدی کی ایک گانٹھ سے ٹکرا کر ٹوٹ گیا" پھر افراد ہی نہیں ' اس کی کہانی زندہ اور آئینے کی طرح صاف ' روز روشن کی طرح درخشاں ہے ۔ منظر نگاری بھی اپنی طرف متوجہ کرتی ہے ، یہ سری پور ہے ۔ یہ بازار یہ شادی کی محفل ، یہ دیہات کی صبح ' یہ ارمانوں کی شام ' کرشن چندر شاعر افسانہ نگار ہے مگر اس کی شاعری اس کی افسانوی صلاحیتوں کو مدھم کرنے کے بجائے اور روشن کردیتی ہے ۔" زندگی کے موڑ پر" زندگی سے کوئی بے معنی صلح نہیں ہے نہ کوئی سستا انقلابی ترانہ ہے"

بلکہ ایک مستقل سوال ہے ؏

منزل ہے کہاں تیری اے لالۂ صحرائی

ایک اور کہانی جو مجھے پڑھتے ہی پسند آئی اور آج بھی پسند ہے راجندر سنگھ بیدی کی "ہڈیاں اور پھول" ہے۔ ایک چڑچڑا شرابی موچی اکثر غصّہ میں آکر اپنی بیوی کو پیٹا کرتا تھا، یہاں تک کہ وہ بیماری اور آئے دن کی مارپیٹ سے تنگ آکر اپنے میکے چلی گئی۔ عرصہ تک اس کی کوئی خبر نہ ملی اور موچی کو خیال ہوا کہ وہ مرگئی مگر اس کی یاد اُسے ستا رہی تھی اور وہ اکثر راتوں کو اس کی چھوٹی چھوٹی چیزوں سے اپنا دل بہلاتا رہا۔ یہاں تک کہ ایک دن اُسے ایک خط سے معلوم ہوا کہ وہ اچھی ہوگئی ہے اور واپس آنے والی ہے۔ اس موچی کی بے قراری، بے صبری، آدھ سیر جلیبی اور پاؤ بھر دودھ اپنی بیوی کے لئے منگوانا کاریگروں کو جلدی چھٹی دے کر اسٹیشن جانا اور وہاں سے مایوس آکر شراب پینا اور نشہ میں گالیاں دینا ذہن پر نقش ہوجاتا ہے آخر دوسری بار اس کی بیوی آجاتی ہے اور اسٹیشن پر "وہ متجسس سہمی ہوئی آنکھیں فکر مندی کے احساس سے پلیٹ فارم پر گھومنے والے خوبصورت سے خوبصورت متمول آدمیوں کے گروہ میں ایک بدصورت قلاّش اور چڑچڑے آدمی کی جویا ہوتی ہیں"۔ بیوی اس ملاپ کے نشے سے سرشار ہے اور ایک خاص قسم کی کیفیت میں ڈوبی چلی جارہی ہے بھیڑ میں اس کی کسی سے ٹکر ہوجاتی ہے مگر موچی اُسے غصّے سے دیکھتا ہے اور کہتا ہے "یہ نئے ڈھنگ سیکھ آئی ہو۔ پھر آگئیں میری جان کو دُکھ دینے۔" یہ قلاّش چڑچڑا اور مریل چمار بیدی کے پرزور مشاہدے کی بنا پر ہماری نظر میں ایک شخصیت کا مالک بن جاتا ہے جو منفرد بھی ہے اور ہم سب کی کمزوری میں شریک بھی، یہ عورت سے بیزار ہے مگر اس کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ بیدی کا فنکارانہ احساس، اس کا قصّہ تعمیر کرنے کا ڈھنگ، اس کا مشاہدہ، اس کا ایسے ماحول کا انتخاب جس سے وہ اچھی طرح واقف ہے باوجود اس کی زبان کی لغزشوں اور اس کی ٹیڑھی میڑھی انشاء پردازی کے، انسان کو

مُتاثر کئے بغیر نہیں رہتا۔ یہی بات زین العابدین اور گرہن میں بھی ہے مجھے اب تک یاد ہے کہ گرہن کا پہلا ہی جملہ پڑھ کر ایک اہلِ زبان نے کہا تھا یہ کونسی زبان ہے کیا یہ اُردو ہے؟ اور مجھے کہنا پڑا تھا۔ ہاں یہ اُردو ہے لیکن ایک پنجابی نے لکھی ہے اور قصہ بحرِ عرب کے سواحل سے متعلق ہے جامع مسجد کی سیڑھیوں سے نہیں۔

علی عباس حسینی کا ایک افسانہ ہے "دو بچے" ایک نواب صاحب کا بچہ ہے جو بڑے چاؤ سے پل رہا ہے وہ ایک چھوٹی سی مہترانی کو دیکھتا ہے، یہ اپنی دادی کے بجائے آئی ہے اور ڈرتی، سہمتی، جھجکتی، گھبراتی اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے اپنے فرائض ادا کرنے میں منہمک ہے، ننھے نواب اسے تعجب سے دیکھتے ہیں۔ اتنے چھوٹے لوگ بھی ہوتے ہیں جن کے بال اُنھیں کی طرح سیاہ، جن کے ہاتھ پاؤں انھیں کی طرح چھوٹے چھوٹے مگر جو کوڑے سے کھیل سکتے ہیں"۔ دو دن وہ اس کو دیکھ کر خوشی کا اظہار کرتے ہیں تیسرے دن اس کے گلے میں بانہیں ڈال دیتے ہیں۔ بس اس پر گھر میں قیامت آجاتی ہے، بڑی انّا مہترانی کے لات مارتی ہے دوسری مامائیں گالیاں دیتی ہیں، بیگم صاحبہ بلا کے گلے چمٹ جانے پر ایک نیا روپیہ اور چاندی کی چوتی خیرات کرتی ہیں، مگر بچہ صرف یہی کہتا ہے۔ "میلی مہترانی بھاگ گئی" بچے کے جذبات کی کیسی اچھی تصویر ہے۔ جذبات بچوں میں بھی ہوتے ہیں مگر ان کی طرف اب تک توجہ کون کرتا تھا۔

اس پر ایک اور کہانی یاد آئی جو ممتاز مفتی کی ہے اور اس کا نام ہے "بیگانگی" رشید کو اپنے چھوٹے بھائی محمود سے چڑ سی ہے۔ محمود نے آکر اس کی وہ جگہ چھین لی ہے جو ماں باپ کے دل میں اس کے لئے تھی۔ اس رقابت اور رشک و حسد نے اُسے شریر، فسادی اور ضدی بنا دیا ہے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کس طرح لوگوں کی توجہ اپنی طرف کرے۔ اس کی شرارتیں درحقیقت محض اپنی شخصیت کے اظہار کی کوششیں ہیں، جب کسی طرح اُس کی طرف کوئی توجہ نہیں کرتا تو وہ راہ چلتوں کے پتھر مارتا ہے اور محمود

کے طوطے کو مار ڈالتا ہے۔

بچّوں کی نفسیات پر تو ویسے بھی بہت کم ریسرچ کی گئی ہے مگر عورتوں اور مردوں کی نفسیات پر ایک ریسرچ تو اُس قسم کی ہے جو عصمت چغتائی کے یہاں ملتی ہے اور دوسری وہ جو اختر انصاری کے ہاں۔ عصمت چغتائی کا کوئی افسانہ لیجیے: مجھے اُن کی ایک کہانی "بھول بھلیاں" پسند ہے۔ ایک کمزور، مریل لاڈلا لڑکا اپنی بہنوں کے پیار سے تنگ آکر اپنی ایک رشتے کی بہن سے اُلجھتا رہتا ہے جو اُس کے یہاں رہتی ہے، یہ اُلجھن رفتہ رفتہ ایک عجیب پُراسرار محبت میں تبدیل ہو جاتی ہے، مگر عصمت چغتائی نے جو عورتوں اور مردوں کی نفسیات پر مہارت اچھی نظر رکھتی ہیں، اس کہانی میں گھریلو زندگی کی دھوپ چھاؤں، بہنوں اور بھائیوں کی لڑائیاں، شادی کی پُراسرار کیفیتیں، لڑکے کی وہ محبت جو بظاہر نفرت معلوم ہوتی ہے اور لڑکی کا رفتہ رفتہ سب کچھ سمجھتے ہوئے اس طوفان میں بہہ جانا بڑی کامیابی سے دکھایا ہے۔

عصمت کے قصّے اگرچہ ایک ہی عمر اور ایک ہی جذبے سے مُتعلق ہوتے ہیں جو پندرہ سے ۲۵ برس تک سب سے تیز ہوتا ہے مگر ان کی تصویروں میں ایک واقعیت بلکہ بے جھجک صداقت ہوتی ہے۔ بعض اوقات ہم اس واقعیت اور صداقت سے چڑ جاتے ہیں۔ کم بخت کسی پاک، مقدّس اور ملکوتی جذبے کو تو ویسا ہی رہنے دیتی مگر توبہ کیجیے، اس ذہین، ضدّی، دوربین نئی عورت سے، یہ ہر شیرینی میں تلخی ملا دیتی اور ہر حسین خواب کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیتی ہے اور اس پر افسوس ہوتا ہے کہ اس تخریب کا حاصل کچھ نہیں ہوتا۔ جس طرح آتشیں شیشے سے کبھی کبھی آگ بھی لگائی جا سکتی ہے، مگر اسے لے کر کوئی میدان میں نہیں نکلا، اسی طرح عصمت کا آرٹ چھیڑ چھاڑ اور آنکھ مچولی کا آرٹ ہے۔ ماہرِ امراضِ خصوصی ہونا اچھی بات ہے مگر بعض امراض ڈاکٹر کو بھی مریض بنا سکتے ہیں۔

اختر انصاری کی کہانیاں پڑھیے تو پہلے پہلے وہ بھی کچھ فضول سی نظر آتی ہیں۔ اتنی سی بات تھی جسے افسانہ کر دیا، یہی خیال پیدا ہوتا ہے مگر نہیں، بات اتنی ہی نہیں، اس کی کوئی کہانی لیجیے مثلاً ایک واقعہ یا ایک قصہ سُنو یا فریب، بظاہر ان قصوں میں بہت کچھ واقع نہیں ہوتا، نہ کوئی محل جگمگاتا ہے نہ کہیں انقلاب آتا ہے۔ کوئی کسی پر عاشق بھی کم ہی ہوتا ہے۔ ہر چیز نہایت خاموشی سے، دھیمی دھیمی، چپ چاپ سی ہے مگر اس خموشی میں بلا کا درد و کرب اور اس دھیمے پن میں نہایت فنکارانہ ضبط و نظم ہے۔ شاعر، جذبات کی رَو میں بہنا چاہتا ہے تو افسانہ نویس اسے بہنے نہیں دیتا۔

ایک واقعہ لیجیے، ایک انٹر کلاس میں چند مسافر ہیں۔ ایک وکیل، ایک خاں صاحب، ایک شاعر، ایک آنریری مجسٹریٹ اور ایک میاں بیوی۔ میاں سو رہا ہے، بیوی، وکیل صاحب، خاں صاحب اور آنریری مجسٹریٹ کی گفتگو سن رہی ہے۔ شاعر اس نوجوان عورت کو دیکھ رہا ہے جو اگرچہ بہت حسین نہیں مگر کسی عورت کی عدم موجودگی میں شاعر کی توجہ کا مرکز بننے کے لئے کافی ہے۔ راستے میں چلتی گاڑی میں شور ہوتا ہے۔ ایک دیہاتی غلطی سے ایک بند ڈبے میں چڑھنے کی کوشش کرتا ہے جب ناکام رہتا ہے تو چلّاتا ہے کہ گاڑی رکواؤ۔ ان سب کے ذہن میں یہ خیال آتا ہے کہ زنجیر کھینچنی چاہیئے مگر اس کے بجائے سب اُسے مختلف قسم کے اُلٹے سیدھے مشورے دیتے رہتے ہیں۔ نوجوان عورت جو اس اثنا میں ساری گفتگو خاموشی سے سُنتی رہتی ہے، اُٹھ کر زنجیر کھینچ لیتی ہے، سب اطمینان کا سانس لیتے ہیں مگر شاعر یہی سوچتا رہتا ہے کہ افسوس یہ عورت پان نہیں کھاتی۔ اگر پان کھاتی تو اس کے ہونٹ کتنے خوبصورت ہوتے

غریبوں کی چیخ پکار، متوسط اور بالائی طبقے کی بے حسی، نقاب پوش زندگی، پیٹ کی آگ اور پھر محبت کی آگ، یہی ہمارے افسانے کے عام موضوع ہیں۔ آپ ان سے گھبرائیں تو گھبرائیں، مجھے تو یہ اس وجہ سے پسند ہیں کہ ان میں ہماری زندگی کا عکس ہے۔"

آپ ہمارے کتابی سلسلے کا حصہ بن سکتے
ہیں مزید اس طرح کی شاندار،
مفید اور نایاب کتب کے حصول کے لئے
ہمارے وٹس ایپ گروپ کو جوائن کریں

ایڈمن پینل

عبداللہ عتیق : 03478848884
سدرہ طاہر : 03340120123
حسنین سیالوی : 03056406067

rekhta

۹

# میری شاعری

دراصل[1] ان سطروں کے لکھنے کی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی — ویسے کچھ لوگوں کے نزدیک شعر و شاعری کی ہی ضرورت نہیں ہے!! مگر شاعری ایک فطری جذبے کی تسکین کا ذریعہ ہے۔ اسے سود و زیاں کے سستے پیمانوں سے نہیں ناپ سکتے — اسی طرح یہ سطریں بھی کسی ضرورت کے ماتحت نہیں بلکہ "خوشی خاطر" لکھی جا رہی ہیں۔

میں شاعری کو انسانیت کے ضمیر کی آواز سمجھتا ہوں۔ اس آواز کی ضرورت ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی، ہاں اس کی لے ہر دور میں بدلتی رہی ہے اور ایسا ہونا قدرتی ہے۔ فرائڈ نے جب شاعری کو ذہنی تسکین یا Substitute Gratification کہا تھا تو اس نے رائی کا پربت بنایا تھا۔ ظاہر ہے کہ شاعری چند محرومیوں کی تلافی بھی ہے مگر اسے صرف سپر یا نشہ سمجھنا بہت بڑی غلطی ہوگی۔

شاعری چند خوابوں کے ذریعہ سے حقائق کی توسیع کرتی ہے۔ وہ زندگی کی سپاٹ اور بے رنگ معروضیت میں معنی خیز اور بصیرت افروز پہلوؤں کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

---

[1] ذوقِ جنوں، صفحہ ۷ تا ۹

وہ تہذیب کا آب و رنگ اور تمدن کا غازہ ہے۔ وہ تخیل کی شمع لے کر ہر ظلمات میں آبِ حیات دیکھتی اور دکھاتی ہے۔ وہ بے دلی، بے حسی اور بے طاقتی میں ذوقِ یقین کی آنچ پیدا کرتی ہے۔ وہ فطرت کے پھولوں سے انسانیت کے لئے سیج تیار کرتی ہے۔ وہ مانوس چیزوں میں نیا پن اور نئی چیزوں میں مانوس حُسن دکھاتی ہے۔ وہ احساس کو اظہار اور اظہار کو تلوار بناتی ہے۔ وہ خلوت کا چراغ ہے مگر انجمنوں کو روشن کرتی ہے۔

وہ الفاظ کے جادو جگاتی ہے، اور اس جادو سے طاقت کا ایک ایسا خزانہ پیدا کرتی ہے جو ہر ظلمت کو چراغاں کر دے۔ وہ ایک زخمی روح کی فریاد ہے مگر دوسری روحوں کے لئے مرہم ہے۔ وہ اپنے لہو سے دوسروں کے چمن کی حنا بندی کرتی ہے۔ وہ حقیقت کی ایک کرن تک پہنچنے کے لئے تن من دھن سب کی بازی لگا دیتی ہے۔ سقراط نے ایک دفعہ زہر کا پیالہ پیا تھا، مسیح کو ایک بار صلیب پر چڑھایا گیا تھا، حُسینؓ نے کربلا میں ایک بار جامِ شہادت نوش کیا تھا۔۔۔۔ شاعر زندگی کا زہر اس لئے بار بار نوش کرتا ہے کہ وہ اِس سے آبِ حیات بنا سکے۔ وہ بار بار صلیب پر چڑھایا جاتا ہے۔ زندگی اس کے لئے ایک مستقل کربلا ہے۔ وہ صداقت کی خاطر ہر بار سربکف ہوتا ہے۔ وہ خوفِ فسادِ خلق کا شکار نہیں۔ وہ کبھی انسانیت کے ترانے گاتا ہے، کبھی حق و باطل کی کشمکش کا رزمیہ پڑھتا ہے کبھی آرائشِ خم کاکل سے کھیلتا ہے۔ کبھی اندیشہ ہائے دور دراز کا اسیر ہوتا ہے۔ کبھی ہر جنت میں جہنم دکھاتا ہے۔ کبھی مستی اندیشہ ہائے افلاکی کا ساز چھیڑتا ہے۔ کبھی زمین کے ہنگاموں کو سہل کرنے کا بار اٹھا لیتا ہے۔ کبھی وہ آنے والے کل کی خاطر آج سے لڑائی مول لیتا ہے۔ کبھی وہ آج کے نقوش میں گزرے ہوئے کل کے کتنے باتجمل کارواں دیکھتا ہے۔ کبھی وہ بظاہر متضاد باتیں کہتا ہے، مگر اس کے یہاں جو ربط و تنظیم ہے وہ سطحی نظر رکھنے والوں کو دکھائی نہیں دیتی۔

اس کا ایک ہاتھ فطرت کے ہاتھ میں ہے اور دوسرے سے اُس نے انسان کی

شوخ، چنچل اور مغرور روح کا ہاتھ تھام رکھا ہے۔ وہ دونوں کے ملاپ کے درپے ہے۔ لوگ دنیا کے جلووں، اُس کی رنگینیوں، اُس کے حسن، اُس کی عظمت، اُس کے رنج و راحت، اُس کے زخم و مرہم، اُس کے فریاد و تبسم سے بیگانہ وار گزر جاتے ہیں۔ شاعر ان سب کو محفوظ کر لیتا ہے، اور کم بینوں کو نظر اور سنگ ریزوں سے دل بہلانے والوں کو لعل و گہر بخشتا ہے۔

وہ علم و حکمت، صنعت و تجارت، سیاست و معیشت سب سے اپنا مواد لیتا ہے۔ وہ ہر گھاٹ سے سیراب ہوتا ہے اور ہر باغ سے پھول چنتا ہے، وہ حسنِ نسوانی کا ہی نہیں زندگی کے سارے حسن کا عاشق ہے۔ عاشق ہی نہیں عارف بھی ہے۔ وہ دلوں کو دردمندی سکھاتا ہے، اور اس دردمندی کو زندگی کی بڑی سچائیوں کی خدمت میں لگا دیتا ہے۔ وہ سستی تفریح یا افیون نہیں جو اعصاب کو مجروح کر دے، بلکہ اعلیٰ اور قابلِ قدر مقاصد کی لگن عطا کرتا ہے۔ اگر دُنیا نے ابھی تک اُس کے منصب کو نہیں پہچانا تو اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں، تعجب تو یہ ہے کہ اُس نے خود اپنے منصب کو نہیں پہچانا ہاں! غالب کو کچھ اس کا احساس تھا، جبھی تو اُس نے کہا ہے:

ہر سنگ و خشت ہے صدفِ گوہرِ شکست
نقصاں نہیں جنوں سے جو سو دا کرے کوئی

ہر دور میں اور ہر ادب میں اچھی شاعری انسانیت، تہذیب، اخلاق، امن اور خوف کی علمبردار رہی ہے۔ اُردو شاعری میں بھی یہ رنگ موجود ہے۔ ولی، میر، سودا، آتش، غالب، انیس، نظیر، حالی، اکبر، اقبال، حسرت، جوش، جگر، فانی، فراق اور فیض کے رنگ محل اسی وجہ سے ہمارا بیش قیمت سرمایہ ہیں۔ موجودہ دور میں جب کہ سائنس کے انکشافات نے فطرت پر اقتدار بڑھا دیا ہے اور انسان کے لئے نیکی اور بدی دونوں کے اَن گنت امکانات ہیں، شاعری ایک شمعِ روشن بھی ہے۔ ایک قابلِ قدر علم بھی اور

کلیت، قنوطیت اور نفس پرستی کے مقابلے کے لئے ایک تلوار بھی۔

شاعری کو نعرہ بازی یا پروپیگنڈے کی ضرورت نہیں، وہ ایک خاموش نعرہ ایک ستھرا اور دل آویز پروپیگنڈا ہے مگر آج شاعر صرف چند روایات کے سہارے زندہ نہیں رہ سکتا، روایات کا احساس رکھتے ہوئے اور فن کے اچھے سانچوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے، اُسے آج کی زندگی سے غذا لینی ہے۔ اسے آج کے درد کا درماں بننا ہے، اُسے صرف امروز میں اسیر ہونا نہیں ہے مگر وہ اندیشۂ امروز کو نظر انداز کر کے آگے بڑھ نہیں سکتا۔

میرے اشعار میں آپ کو شاعر کے منصب، اس کی نظر کی جامعیت، اُس کی بنیاد اور اُس کی فضا، سب کا احساس ملے گا۔ ہاں! ان احساسات کی شعریت اور اس کی حُسن کاری کے متعلق فیصلہ آپ کا کام ہے۔

میں لیلائے شاعری کے گیسو کا اسیر شروع سے ہوں، مگر میں صرف اس کا اسیر ہو کر نہ رہ سکا۔ مجھے نثر کے جلوے بھی پسند ہیں، میں ادب کو ایک بُتِ ہزار شیوہ سمجھتا ہوں اور اس کی ہر ادا کا پرستار ہوں، مگر میرے مطالعے اور تجربے نے مجھ پر یہ نکتہ بھی روشن کیا ہے کہ ادب، سائنس کی طرح زندگی کے حقائق کی تلاش ہے۔ سائنس اور ادب کا راستہ مختلف ہے مگر دونوں کی منزلِ مقصود ایک ہی ہے اور وہ ہے انسان اور اُس کے ماحول کا بہتر اور پختہ تر عمل، پھر مجھے یہ بات بھی معلوم ہوئی ہے کہ ادب اور سائنس میں بھی خانے نہیں ہیں بلکہ سینکڑوں راستے ایک سے دوسرے کو ملاتے ہیں۔ آج کا ادب سائنس سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ اسے سائنس کا بہت کچھ علم حاصل کرنا ہے اور سائنس کو بھی ایک معیارِ اخلاق اور ایک تہذیبی اور انسانی تصور دینا ہے۔

فرائڈ کو جب علمِ نفسیات کی دریافت پر مبارک باد دی گئی تو اُس نے اعتراف کیا کہ یہ دنیا میری دریافت نہیں ہے مجھ سے پہلے شاعروں اور فلسفیوں نے اس دنیا کا پتہ لگایا ہے۔ ہاں! میں نے اس کے قواعد مرتب کرنے کی کوشش کی ہے جس طرح

سائنس دانوں کو شاعروں کے اشاروں اور فلسفیوں کے نظریات سے مدد ملتی ہے اسی طرح شاعروں کو سائنس کی بدولت فطرت، انسان اور دونوں کے ایک دوسرے پر اثرات کا بہتر علم ہوا ہے۔ کوئی اچھا شاعر اس علم سے منہ موڑ کر نہیں بیٹھ سکتا۔ ہاں اس علم کو اپنے طریقے سے برتتا ہے۔

حسنِ اتفاق سے مجھے کالج میں چار سال تک سائنس کے مطالعے کا موقع ملا، اور اس مطالعے سے میں نے اور کچھ نہیں تو طبیعاتی اور حیاتیاتی علوم کے مبادیات سیکھے۔ سائنسی طریقۂ کار سے آشنا ہوا، اور اس سے مجھے ادب اور زندگی کے رشتے کا بہتر علم حاصل ہوا۔ میرا ایمان ہے کہ یہ علم ایک شاعر اور ایک ادیب کے لئے کمزوری نہیں بلکہ طاقت ہے، یہ اس کے تخیل کو بے راہ نہیں ہونے دیتا۔ یہ اُسے فضا میں پرواز سے منع نہیں کرتا، مگر اُسے ایک بُنیاد ضرور دیتا ہے۔ حقائق خوابوں کی توسیع کرتے ہیں اور خواب حقائق کی۔ اُردو کے شاعروں کو اس نکتے کو ذہن میں رکھنا چاہیئے۔ اقبال کے الفاظ میں عشق کو کبھی پیروی عقلِ خداداد سے بھی فائدہ ہوتا ہے۔

(کہیں شروع میں ذکر کر چکا ہوں کہ) میں بدایوں کے ایک متوسط خاندان میں پیدا ہوا۔ قرآن شریف، اُردو اور تھوڑی سی فارسی ایک مکتب میں پڑھی۔ پھر انگریزی اسکول میں تیسرے درجے میں میرا نام لکھا دیا گیا۔ بچپن میں ہی مجھے مطالعے کا بہت شوق تھا، اور جو کتاب ہاتھ آجاتی بے پڑھے نہ چھوڑتا۔ شاید دس گیارہ سال کی عمر میں طلسمِ ہوشربا پڑھنے کو مل گئی غالباً دس پندرہ دن میں تین چار جلدیں چاٹ گیا۔ اُسی زمانے میں کہیں سے ابنِ خلدون کا ترجمہ ہاتھ لگا، وہ پڑھ ڈالا۔ اُسی زمانے میں شاعری شروع کی جو تُک بندی اور قافیہ پیمائی ہی تھی۔ والد کی ملازمت ڈاک خانے میں تھی۔ جلد جلد تبادلہ ہوتا تھا۔ اکثر اسکول ڈاک خانے سے دُور ہوتا۔ ڈیڑھ دو میل کا راستہ پیدل طے کرنا پڑتا۔ اس زمانے میں مجھے خیالی پلاؤ پکانے کی عادت پڑ گئی تھی، گھر سے نکلا اور ذہن کو

آزاد چھوڑ دیا۔ کبھی اپنے کو فاتح سمجھتا کبھی مُصنّف، کبھی عاشق کبھی حکمران، کبھی سرکاری افسر اور اس طرح راستہ مزے سے طے ہو جاتا۔ طالب علمی کے زمانے میں سوائے حساب کے ہر مضمون میں تیز سمجھا جاتا تھا۔ حساب میں دِل نہیں لگتا تھا۔ اساتذہ عام طور سے بڑی محبت سے پیش آتے۔ طلبا بھی عزت اور خلوص سے ملتے۔ میں زود رنج تھا جلد خفا ہو جاتا تھا، مگر جلد صاف بھی ہو جاتا تھا۔ میں نے چھ اسکولوں میں پڑھا۔ عام طور سے ہندو طلبا زیادہ ہوتے تھے، مسلمان بہت کم۔ مگر مجھے کبھی غیریت اور اجنبیت محسوس نہیں ہوئی، حالانکہ بڑایوں میں مذہبی ماحول تھا، مگر شاید میرے والد کے خیالات کا اثر تھا کہ مجھ میں فرقہ واریت کا جذبہ کبھی پیدا نہیں ہوا۔ بڑایوں میں میلاد اور عُرس بہت ہوتے تھے۔ میرے پڑوس میں ایک بزرگ مولوی عطا احمد کیف رہتے تھے جن کا مشغلہ گاؤں اور کچہری کے جھگڑے اور شاعری تھا۔ یہ قصائد لکھتے تھے وہ بھی نعت اور منقبت میں، عرس کے موقع پر بھی نعت اور منقبت کی محفلیں ہوتیں۔ شاید شاعری سے لگاؤ انہیں اثرات کا نتیجہ ہے۔

مجھے[1] پہاڑوں اور دریاؤں سے ہمیشہ دلچسپی۔ بی۔ یونیورسٹی میں چھٹیاں ہوتیں تو کسی پہاڑ کی سیر کو چلا جاتا۔ ۱۹۲۲ء میں پہلی دفعہ کشمیر گیا تھا۔ اس کے بعد نینی تال، مسوری، شملہ، رانی کھیت، الموڑہ، اوٹاکمنڈ بھی جانے کا اتفاق ہوا۔ پہاڑی راستوں پر چھپرتے اور دریاؤں کے کنارے محویت کے عالم میں بیٹھے میں نے گھنٹوں گزارے ہیں۔ ۱۹۳۲ء میں سونامرگ میں اکثر گلیشیر کی وادی میں انگریزی کے رُومانی شعرا کا کلام پڑھتا یا شعر کہتا تھا۔ میری فطرت میں جو رومانیت ہے اُسے پہاڑوں نے بُوا بھی دی اور اُس کو آسودہ بھی کیا۔

ہندوستان کی جنگِ آزادی، روس میں اشتراکیت کے تجربے، ترقی پسند تحریک سے میں نے گہرا اثر قبول کیا ہے۔ چونکہ میں ایک معلّم ہوں اس لئے مجھے تعلیمی مسائل سے خاص طور

---

[1] ذوقِ جنوں، صفحہ ح تا ن

دلچسپی ہے۔ مجھے ادبی جلسوں اور تعلیمی کانفرنسوں میں شرکت کی وجہ سے طلبا، شاعروں، اور ادیبوں اور قومی کارکنوں سے اکثر ملنے کا اتفاق رہا ہے۔ میں دیہات کا زیادہ علم نہیں رکھتا مگر وہاں کے حالات سے ناواقف نہیں ہوں۔ ہاں! شہروں کے رہنے والوں اور اُن کے حالات و کیفیت کا علم زیادہ ہے میں نے اپنی آنکھیں کھُلی رکھی ہیں، اور دُنیا کی رفتار اور ہندوستان کی سیاست کا خاص طور سے مطالعہ کرتا رہا ہوں، میں ادیبوں اور شاعروں کی ذہنی بے تعلقی اور بے نیازی کا قائل نہیں ہوں، ہاں! یہ ضرور محسوس کرتا ہوں کہ وہ اپنے مخصوص دائرے میں سماج کی خدمت بہتر طور پر انجام دے سکتے ہیں قلم بھی تلوار ہے مگر وہ ذہنی تلوار ہے۔ سیاست اور اُدب میں کوئی بیر نہیں ہے مگر دونوں کے مخصوص مطالبے ہیں۔ ادیب اور شاعر کے لئے سیاسی شعور مفید ہے، سیاست میں انہماک سے اُسے زندگی کا گہرا تجربہ حاصل ہوتا ہے، مگر سیاسی نصب العین اور سیاسی پروگرام میں فرق ہے نصب العین سے ادیب کو مدد ملتی ہے۔ سیاسی پروگرام کی پابندی اکثر اس کے راستے میں خلل انداز ہوتی ہے۔ ہمارے بیشتر ادیب اور شاعر متوسط طبقے سے تعلق رکھتے ہیں، اس متوسط طبقے کو اپنی نظر وسیع کرنی چاہیئے، اور عوامی مفاد میں شریک ہونا چاہیئے۔ اس کی فکر میں عمومیت اور اُس کے فن میں عام اپیل ضروری ہے مگر عوامی اُدب دراصل پڑھے لکھے عوام پیدا کریں گے۔ متوسط طبقے کے شاعر اس کے لئے فضا ہموار کر سکتے ہیں وہ خود عوامی ادب پیدا نہیں کر سکتے۔ وہ اپنی بات کو اُسی وقت اپنے بڑھتے ہوئے حلقے تک پہنچا سکتے ہیں جب اُن میں فن کی آزمودہ روایات کے احساس کے ساتھ موجودہ دَور کے مسائل کا احساس ہو۔ جب ان کی شاعری معیاری اسالیب کو برتتے ہوئے تجربات کے لئے راہیں کھول سکے۔ اس کے لئے غزل، نظم اور آزاد نظم سب سے کام لیا جا سکتا ہے، مگر ظاہر ہے کہ آزاد نظم سے لوگ ابھی اتنے مانوس نہیں ہیں۔ غزل اور پابند نظم کی اپیل زیادہ ہے۔

غزل کے خلاف جو طوفان اُٹھ کھڑا ہوا تھا، وہ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ میں یہ مانتا

ہوں کہ غزل شاعری کی معراج نہیں ہے۔ میں غزل کی بے ربطی اور انتشار کو بھی ایک بڑی کمزوری سمجھتا ہوں۔ مجھے یہ احساس ہے کہ غزل کی وجہ سے ہمارے شعرا کی تعمیری صلاحیت کو بڑا نقصان پہنچا ہے۔ وہ مینا کاری کر سکتے ہیں مگر کوئی ایسا نقش پیش نہیں کر سکتے جس میں اجزا مل کر کُل کا ایک حسین تصور پیش کرتے ہوں۔ غزل چونکہ لطیف اشاروں کا آرٹ ہے اس لئے ہمارے شاعر کھُل کر کوئی بات نہیں کہہ سکتے، مربُوط اور مسلسل تصویریں نہیں بنا سکتے مگر غزل صدیوں سے ہمارے رگ وپے میں رچی ہوئی ہے، نفسیات کا معمولی طالب علم بھی یہ جانتا ہے کہ جو چیزیں اس طرح مزاج بن گئی ہوں اُن کو یک قلم خارج نہیں کیا جا سکتا۔ ہاں! اُن کی خامی اور کوتاہی کا احساس دلا کر دوسری چیزوں کے لئے ذہن پیدا کیا جا سکتا ہے۔ پھر غزل باوجود اپنی بے ربطی اور انتشار کے اپنے ہر شعر میں ایک بھرپور نقش رکھتی ہے، اور یہ نقش ذہن پر بڑی جلد مرتسم ہو جاتے ہیں۔ غزل کا اسلوبِ بیان باوجود پُرانا ہونے کے مخصوص تجربات کو ایک عمومی رنگ دے دیتا ہے۔ اس کے رمز وایما میں اب بھی بڑی وسعت وجامعیت ہے۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ ۱۹۴۷ء کے بعد تقسیم، فسادات اور تہذیب وانسانیت کی تاراجی پر جو ماتم ہوا، اور آزادی کے خواب جس طرح برباد ہوئے اُن کا بیان غزل میں بڑی آسانی اور خوبی سے ہو گیا۔ غزل نے ان جذبات کی تنقیہ کا کام کیا جو دلوں کا چور بن کر سماج کو مسموم کر سکتے تھے۔ پھر اس میں حُسن کی پرستش اور ذوقِ جمال کی تسکین کا جو سامان ہے اُسے کوئی منصف مزاج نظرانداز نہیں کر سکتا۔ اس کی ابدی کشش بھی مسلّم ہے، اس لئے غزل کو یک قلم ترک کر دینے کا شوق چاہے کتنے خلوص اور نیک نیتی سے دیا جائے قابلِ قبول نہیں ہے۔ ہاں شعرا کو نظم کی طرف مائل کرنے اور اُس کے امکانات سے کام لینے کی طرف ضرور راغب کرنا چاہیئے۔ میرا ایمان ہے کہ اُردو شاعری کا مستقبل غزل سے نہیں نظم سے وابستہ ہے، مگر غزل میں ہر دَور کے تقاضوں کو ایک حد تک پورا کرنے کی جو صلاحیت ہے اور اس کے مانوس حُسن

میں جو کشش ہے اُس کے پیشِ نظر غزل برابر کہی جاتی رہے گی، اور اس کے ذریعے سے ہمارے شعراء حیات و کائنات، حسن و عشق، فکر و نظر کے متعلق دلکش اور لطیف اشارے کرتے رہیں گے۔

میں نے نظمیں بھی کہی ہیں اور غزلیں بھی۔ میری غزلوں میں سیاست، تہذیب، شعر و ادب، تعلیم، معاشرت، سبھی موضوعات ملتے ہیں۔ ہندوستان کے شعراء دوسرے ملکوں کے شعراء سے زیادہ سیاست کے چکّر میں گرفتار ہیں۔ یہ ایک حد تک فطری ہے، مگر غور سے دیکھنے والوں کو یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ اب سیاست کا رومانی یا سہما تصوّر ہمارے یہاں کم ہو رہا ہے، اور اس کی جگہ زیادہ حقیقی، پائیدار، بلند اور جامع تصوّر آ رہا ہے۔ میں اسے فالِ نیک سمجھتا ہوں، جدید اُردو شاعر اپنے پیش رووں سے زیادہ باشعور ہے۔ اُسے تو یقین کی وہ شمع ملی جس کے سہارے پچھلی نسل کے لوگ آنکھ بند کر کے چلے جاتے تھے، نہ وہ رومانیت جو کسی کی تصویر کو سینے سے لگا کر میرے مرجانے کو ایک مقدّس فریضہ سمجھتی تھی۔ اس کی خوبی یہ ہے کہ وہ باوجود سنگین حقائق سے چور چور ہو جانے کے اب بھی ایک حسین زندگی کے خواب دیکھتا ہے۔ حُسن کی ہر ادا اُسے اب بھی بے چین کر رہی ہے۔ اب بھی وہ ظلمات میں آبِ حیات کی تلاش کرتا ہے۔ انسانوں کی بربریت کے وہ کتنے ہی مناظر دیکھ چکا ہے، اور اس نظارے نے بارہا اُسے افسردہ اور مضمحل کیا ہے، مگر وہ زندگی اور انسانیت سے مایوس نہیں ہوا ہے۔ وہ جنگ کی غارت گری اور تباہی سے واقف ہے، اور اس لئے امن کا خواہاں ہے۔ وہ آسانی سے ہر خضرِ راہ یا سیاست کے مداری کے فریب میں آنے والا نہیں۔ حُسن اب اس کے لئے اتنا مقدّس نہیں رہا، اور عشق کو بھی وہ اب ایک آسمانی اور ملکوتی جذبہ نہیں سمجھتا۔ وہ کچھ چڑچڑا، کچھ کھُسرا، کچھ اُداس ہے مگر وہ مایوس یا قنوطی نہیں ہے۔ وہ محض نشاطِ روح کا قائل نہیں رہا۔ جسم کی آنچ کو بھی محسوس کرنے لگا ہے۔ وہ روایتی مذہب و اخلاق، سرمایہ و سامراج کے بندھنوں کا قائل

نہیں رہا۔ وہ شکنجوں کو زیور نہیں سمجھتا، مگر مجموعی طور پر اس آزادی کے باوجود بے لگام، بد راہ اور بے قابو نہیں ہے۔ انسانیت، تہذیب اور امن و اخوت کے رشتوں کی اہمیت کو محسوس کرتا اور مانتا ہے۔ وہ جہاں کوئی اچھا خیال یا اچھا اسلوب، دیکھتا ہے اُسے اپنانے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ اپنی سرزمین سے رشتہ قائم رکھتے ہوئے ساری کائنات کے حُسن کو بھی جذب کرنا چاہتا ہے۔ وہ عالمی تہذیب سے بہت کچھ حاصل کرنا اور اُسے کچھ نہ کچھ دینا بھی چاہتا ہے۔

میری نظموں اور غزلوں میں آپ کو یہ سب باتیں کہیں نہ کہیں مل جائیں گی، کہیں کہیں شاید متضاد چیزیں بھی نظر آئیں۔ والٹ وٹمین نے اپنی ایک نظم میں بڑے پتے کی بات کہی تھی:

"کیا میں متضاد باتیں کہتا ہوں؟ جی ہاں! میں ایسا کرتا ہوں"

جو شاعر زندگی کے تمام پہلوؤں کو سمیٹنا اور سمونا چاہے گا، اس کے یہاں آپ کو کچھ نہ کچھ تضاد ضرور ملے گا۔ ہمارے شعرا میں اقبال کے یہاں وحدتِ فکر سب سے زیادہ ہے، مگر تضاد کا احساس اُن کے یہاں بھی ہوتا ہے۔ شاعری میں نمایاں رُجحانات کی بنا پر رنگِ سخن کا اندازہ کیا جاتا ہے منطقی اور میکانیکی وحدت کا متحمل شاعری کا لطیف اور نازک پیکر نہیں ہو سکتا۔

دورِ حاضر کا شاعر غمِ جاناں سے زیادہ غمِ دوراں کا شکار ہے۔ میری شاعری میں دونوں پہلو آپ کو مل جائیں گے۔ میں حُسن کے ہر رنگ سے متاثر ہوا ہوں سرِ فلک پہاڑوں کے جلال سے، دریاؤں کی مترنم روانی سے، سبزے کی سُہانی کیفیت سے، چاندنی کے لطیف ریشمی غبار سے، عورت کے شباب سے، شباب کی ہزار شیوہ اداؤں سے، زُلفوں کے بادل سے لب و رخسار کے جادو سے، بچوں کے بے ساختہ تبسم سے، اُن کی دل آویز باتوں سے، دوستی کے فنِ لطیف سے، رفاقت، خدمت، ایثار، حق و صداقت کے مظاہروں سے، بجلی کی روشنی کی جگمگاہٹ سے، کارخانوں کے مصروف ہنگاموں سے، مشینوں کی پھرتی تیزی اور باقاعدہ

اور منظم رفتار سے، بڑے مقاصد کی خاطر قربانی سے، دنیا کے مایۂ ناز مصنفین کے فطرتِ انسانی کے متعلق نظریات سے، غرض یہ داستان بڑی طویل ہے۔ کہاں تک بیان کی جائے

اپنی نظموں اور غزلوں کے متعلق میں کیا کہوں۔ یہ ضرور چاہتا ہوں کہ معذرت، کل اور آج، اندھیرا اور اُجالا، سعی وفا، دو قدریں، عزم کوہ کنی، سکوت یا موت ماتم کیوں؟ کو نظر انداز نہ کیا جائے، میں یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ ان میں سے فلاں میری بہترین نظم ہے۔ میری نظمیں اور غزلیں زیادہ تر آمد کا نتیجہ ہیں۔ جی چاہتا تھا کہ ان پر اطمینان سے نظرِ ثانی ہو، مگر ایسا نہ ہو سکا۔ مجھے ایمانداری سے یہ احساس ہوتا ہے کہ فکری شاعری کے لئے جس عرق ریزی اور بھرپور توجہ کی ضرورت ہے وہ میں نہ دے سکا۔ میں شاعری کے ساتھ شعر کا بھی دلدادہ ہوں پھر ادب کے علاوہ تعلیمی مشاغل، سیاسی مسائل اور زندگی کی سینکڑوں رعنائیاں اور رنگینیاں مجھے اپنی طرف کھینچتی ہیں۔ مجھ میں بہت کچھ جاننے، سیکھنے، چھونے، چکھنے، حاصل کرنے اور لٹانے کی خواہش ہے مجھے اپنے زمانے سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ مجھے ناقدی کا احساس بھی نہیں ستاتا۔ جو ادبی تعلیمی متن میں نے اپنا لیا ہے اُس سے مجھے روحانی تسکین ضرور ہوتی ہے، مگر ایک بے اطمینانی، ایک تشنگی، ایک کمی کا احساس میرا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ میری شاعری میں شاید آپ کو اس ذہنی سفر کی داستان مل جائے گی جو حیرت و حسرت، مسرت و بصیرت، سب کا سامان رکھتا ہے۔ شاید اُس بے چین روح کی رُوداد بھی جو چند خوابوں کے سہارے حقائق کی توسیع بھی کرتی رہی، اور ان حقائق سے پامال بھی ہوتی رہی جسے تعلیمی اداروں میں مقبرے دیکھ کر اذیت ہوئی، جسے جنتا کے جشن میں بدمستی بھی نظر آئی اور جسے عارفوں کے جنوں اور عامیوں کے فسوں سے دُکھ ہوا مگر جس نے ان کے باوجود اپنی سرزمین، اپنی تہذیب اور اپنے ماحول سے محبت نہ چھوڑی، اور اس محبت پر کبھی شرمندہ نہ ہوا۔

۱۹۳۵ء[1] میں میرا پہلا مجموعۂ کلام "سلسبیل" کے نام سے شائع ہوا تھا۔ اس میں کچھ نظمیں تھیں، کچھ غزلیں ––– رسالوں میں اس پر حوصلہ افزا تبصرے ہوئے تھے مگر ۱۹۳۶ء کے بعد سے میں کوشش کر کے نثر کی طرف متوجہ ہو گیا، شاعری ترک تو نہ کر سکا، مگر یہ کبھی کبھار کی چیز رہ گئی ––– ۱۹۴۶ء تک یعنی لکھنؤ پہنچنے تک کم و بیش یہی عالم رہا۔

زبان و[2] بیان کے متعلق ایک بات اور کہہ دوں۔ مجھے شاعری میں کلاسیکل انداز بیان کی نوک پلک اور نفاست پسند ہے، گو اس میں جذبے کی گرمی اور گداز بھی چاہتا ہوں۔ میں نے میرؔ، غالبؔ، اقبالؔ سب سے فائدہ اٹھایا ہے۔ کہیں کہیں انگریزی شعرا کے مطالعے کا عکس بھی آپ کو مل جائے گا۔ میں اپنے طور پر صحت زبان کا خیال رکھتا ہوں، اور ادبی مزاج کا قائل نہیں ہوں، لیکن کہیں کہیں لطافت کا تقاضہ ہوتا ہے یا بات کہنی ضروری ہوتی ہے تو قواعد کے حصار کا اتنا خیال نہیں رکھتا۔ قید کی حد میں آزادی کی حد بڑھا لینے کو میں برا نہیں سمجھتا۔ میں زندگی اور ادب دونوں میں اُس جنون کا قائل ہوں جو باشعور بھی ہے (میرے دوسرے شعری مجموعے کا نام "ذوقِ جنوں" ––– میرے خیال میں میری شاعری اور زندگی دونوں کی نمائندگی کرتا ہے۔ (یہ ۱۹۵۵ء میں لکھنؤ سے شائع ہوا) –––

---

[1] "ذوقِ جنوں، صفحہ ح"

[2] "ذوقِ جنوں، صفحہ ن"

rekhta

(۱۰)

---

# فنِ تنقید کے بارے میں میرے تصورات

"تنقید ایک فن ہے مگر اس فن کے حاصل کرنے کے لئے شعریت، دوسروں کی بنائی ہوئی دنیا یا اس کے تجربے تک پہنچنے کی صلاحیت اور زندگی کی اچھی قدروں کا شعور ضروری ہے۔" [تنقید کیا ہے، صفحہ ۳۷]

○

"تنقید کے لیے ایک فطری مناسبت ضروری ہے مگر بہرحال یہ ایک فن ہے اور اس کے لیے خلوص اور ریاض بھی لازمی ہے۔" [ادب اور نظریہ، ۵]

○

"صحیح تنقید کا راستہ بال سے زیادہ باریک ہے۔" [تنقید کیا ہے، ۱۹۳]

○

"تنقید ایک فن ہے، اس کے بھی کچھ لوازم ہیں، اس کے بھی کچھ اصول ہیں۔"
[تنقید کیا ہے، ۱۳۸]

○

"تنقید کے لیے ایک جامع اصطلاح (کے طور پر) "پرکھ" کا لفظ سب سے زیادہ موزوں ہے۔ اس میں تعارف، ترجمانی اور فیصلہ سب آجاتے ہیں۔ پرکھ کے لفظ کے ساتھ ہمارے ذہن میں ایک معیار یا کسوٹی آتی ہے۔ نقاد کے ذہن میں ایسا ایک معیار ضروری ہے۔"
[تنقید کیا ہے، ۲۱۲]

○

"پارکھ بننے کے لیے بڑے ضبط و نظم، بڑے ریاض اور بڑے رسا ذہن کی ضرورت ہے، جیسی تو اردو تنقید میں مُبلغ اور نقیب بہت ہیں، پارکھ اور مُبصر کم۔"
[تنقید کیا ہے، ۲۱۵]

○

"مُبصر یا پارکھ اپنا فیصلہ سنوانے کے درپے نہیں رہتا اور تمام نقاد اس بات سے متفق ہیں کہ نقاد کو بھی آمر نہیں ہونا چاہیے۔"
[تنقید کیا ہے، ۲۱۳]

○

"تنقید ایک سائنٹفک تجزیہ اور تجربات کی پرکھ ہے، محض ایک ذاتی تأثر کا اظہار نہیں ہے۔"
[نقوش، لاہور، خطوط نمبر ۳، اپریل مئی ۱۹۶۸ء صفحہ ۵۲]

○

"تنقید تجربے کی ترجمانی کا نام نہیں مگر ترجمانی کے بغیر تبصرے کا کام اچھی طرح انجام نہیں پا سکتا۔"
[مسرت سے بصیرت تک، ۶۷]

○

"نقاد کو ترجمانی کے فرائض سے اچھی طرح عہدہ برآ ہونے کے لیے خارجیت سیکھنی چاہیے۔"
[تنقید کیا ہے، ۲۱۳]

○

" نقاد کو سائنٹفک اصولوں سے مدد لینی چاہیے "  [تنقید کیا ہے، ۲۱۳]

○

" تنقید میں صحیح بات کہنا، نئی بات کہنے سے زیادہ اہم ہے "

[نقوش، لاہور، خطوط نمبر ۳، ص ۵۲۰]

○

" نقاد کو اپنے موضوع سے گہری واقفیت ہونی چاہیے اور اس کے ساتھ اس سے کچھ وابستگی بھی، مگر اس وابستگی کے ساتھ ساتھ نظر میں ایک آزادی بھی درکار ہے تاکہ وہ ہر موضوع کو ادب کے بڑے موضوعات اور زندگی کے گہرے حقائق کی روشنی میں دیکھ سکے۔"  [ادب اور نظریہ، ۵]

○

" نقاد کو تجربات کے متعلق فیصلہ کرنا پڑتا ہے اور وہ کرتا بھی ہے، مگر دراصل اس کا کام شعور کو بیدار کرنا ہے۔"  [ادب اور نظریہ، ۷]

○

" (نقاد) قدروں کا خالق، برتنے والا اور پھیلانے والا ہوتا ہے "

[تنقید کیا ہے، ۲۱۱]

○

" قدروں کے خالق کی حیثیت سے (نقاد) قدروں کے برتنے کے تماشے کو ذرا بلندی سے بھی دیکھ سکتا ہے اور برتنے والے کی حیثیت سے وہ محض پھیلانے والے (یا مبلغ) سے اونچا مقام رکھتا ہے، اس وجہ سے اس کی تبلیغ دوسرے کی تبلیغ سے بہتر ہوتی ہے۔ اس میں زیادہ ابدیت ہوتی ہے، ہم اس سے دور تک اور دیر تک کام لیتے ہیں۔" [تنقید کیا ہے، ۲۱۱]

○

"ہر فن کار کی شخصیت کے دو حصے ہوتے ہیں۔ ایک حصہ تجربہ حاصل کرتا ہے دوسرا اس میں رنج و راحت کو ذرا بلندی سے دیکھتا ہے اور اس کی قدر و قیمت متعین کرتا ہے۔" [تنقید کیا ہے، ۱۵۸]

○

"اگر فن کار بعض اوقات اپنے رنج و راحت کو ذرا بلندی سے نہ دیکھ پائے تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے، مگر اس سے نقاد کی اہمیت اور عظمت کم نہیں ہوتی اور مُسلّم ہو جاتی ہے۔" [تنقید کیا ہے، ۱۹۸]

○

"نقاد اپنے دور کو سمجھتا ہو اور دوسروں سے واقف ہو تو بھی اس کے لئے ایک خطرہ باقی رہ جاتا ہے، وہ آسانی سے فلسفہ سیاست یا نفسیات کی آغوش میں پہنچ سکتا ہے۔" [تنقید کیا ہے، ۲۱۰]

○

"نقاد . . . بقول رچرڈس کے، ذہن کے ساتھ وہی عمل کرتا ہے جو ڈاکٹر جسم کے ساتھ۔" [تنقید کیا ہے، ۲۱۱]

○

"رچرڈس نے غلط نہیں کہا ہے: "جو کام ایک ڈاکٹر جسم کے لئے کرتا ہے، تنقید ادب کے لئے کرتی ہے۔ وہ ذہنی صحت کا معیار قائم کرتی ہے۔" [تنقید کیا ہے، ۳۰]

○

"نقاد حیات اور ادب کا نباض ہوتا ہے۔" [نئے اور پرانے چراغ، ۱۲۰]

○

"نقاد جب کسی کا تعارف کراتا ہے تو اس کا تعارف کسی نقیب کی پکار نہیں ہوتا،

ایک سیّاح کی دریافت ہوتا ہے۔" [تنقید کیا ہے، ۲۱۳]

○

"نقاد بھی اپنی دنیا کا کولمبس ہے۔ وہ پڑھنے والے کو ایک نئی فضا میں لے جاتا ہے، جس کا حسن اُس نے دریافت کیا ہے۔" [تنقید کیا ہے، ۲۱۳]

○

"نقاد معلّمِ اخلاق بھی ہوتا ہے، مگر محض معلّمِ اخلاق نہیں ہوتا۔" [تنقید کیا ہے، ۲۱۴]

○

"نقاد جج بھی ہوتا ہے مگر محض جج نہیں۔ وہ مُبصّر یا پارکھ ہوتا ہے۔"
[تنقید کیا ہے، ۲۱۴]

○

"نقاد مُبشّر ہوتا ہے، مُبلّغ یا مفتی نہیں ہوتا۔" [ادب اور نظریہ، ۷]

○

"(نقاد) بعض رنگوں کا مداح ہو سکتا ہے اور بعض کا مخالف، مگر وہ محض یک طرفہ تعیین نہیں ہو سکتا۔" [ادب اور نظریہ، ۷]

○

"نقاد محض فلسفی یا مُبلّغ یا ماہرِ نفسیات نہیں ہوتا، وہ صاحبِ نظر ہوتا ہے۔"
[تنقید کیا ہے، ۲۱۱]

○

"(نقاد) کی جاننے کی خواہش کو کبھی مُردہ نہیں ہونا چاہیے۔" [تنقید کیا ہے، ۲۰۷]

○

"نقاد اور پُجاری دو الگ الگ مخلوق ہیں، نقاد پُجاری نہیں ہوتا، نہ وہ محتسب

یا کوتوال ہوتا ہے ۔" [تنقید کیا ہے ، ۲۰۸]

○

" نقاد ذوقِ سلیم کی روشنی میں قابلِ قدر ، معنی خیز اور بصیرت افروز تجربات کا پتہ چلاتا ہے ۔ ان پر غور کرتا ہے اور دوسروں کو غور و فکر کی دعوت دیتا ہے ۔"

[نئے اور پرانے چراغ ، ۱۴۰]

○

" نقاد قدروں کے تعین میں عدالتی فیصلے سے بچتا ہے ۔ وہ حکم نہیں دیتا ۔ وہ بہترین ناموں کی فہرست مرتب نہیں کرتا ، نہ وہ پستی کے درجے متعین کرتا ہے ۔"

[نئے اور پرانے چراغ ، ۱۴۰]

○

" موجودہ دور کے نقاد کے لئے ناگزیر ہے کہ وہ ادبی تاریخ کو نظر میں رکھتے ہوئے شخصیت اور ماحول دونوں کی روشنی میں فکر و فن کے رموز کا پتہ چلائے اور ان کی قدر و قیمت متعین کرے ۔" [نئے اور پرانے چراغ ، ۱۴۰]

○

" فکر و فن کے رشتے کو سمجھتے ہوئے بھی دونوں کا الگ الگ احساس اور دونوں کا محاکمہ ہر نقاد کے لئے ضروری ہے ۔" [نئے اور پرانے چراغ ، ۱۳۰]

○

" نقاد محض واقعات ...... بیان نہیں کرتا ، اس لئے وہ نسل بندی پر مجبور نہیں ہے ۔"

[تنقید کیا ہے ، ۲۰۴]

○

" نقاد کے لئے ضروری ہے کہ ماضی کے کسی کارنامے کا تجزیہ کرتے وقت وہ خود ماضی

میں پہنچ جائے۔ ماضی سے منہ موڑ کر بیٹھنا کسی حال میں صحیح نہیں۔"

[تنقید کیا ہے، ۲۰۴]

○

"ماضی کا احساس اور چیز ہے اور ماضی کا پابند ہونا اور چیز، اگر نقاد محض روایات کا احترام کرتا ہے محض لکیر کا فقیر ہے، محض بیسویں صدی کے ذہن کو سترھویں صدی کی طرف لے جانا چاہتا ہے تو وہ اپنے مقام سے گر جائے گا۔"

[تنقید کیا ہے، ۲۰۶]

○

"ماضی کا احساس اور ماضی کے دھندلکے میں ایک ادبی تسلسل کا جلوہ (نقاد کو) تجربے، انوکھے پن، نئے پن اور اپج سے بے نیاز نہیں کر سکتا۔"

[تنقید کیا ہے، ۲۰۶]

○

"جو نقاد فن کے پیچ میں الجھ جاتا ہے، فن کے بدلتے ہوئے شعور کو نہیں دیکھتا الفاظ کی صحت و غلطی میں خلق کے تصرف کو نہیں سمجھتا، وہ روایتی تنقید کرتا ہے۔"

[نئے اور پرانے چراغ، ۱۳۰]

○

اگر کوئی نقاد صرف اخلاقی پہلو کو دیکھتا ہے یا صرف افکار پر توجہ کرتا ہے اور فن کے جادو اور حسن کار از معلوم نہیں کرتا تو وہ اپنے منصب کو نہیں پہچانتا۔"

[نئے اور پرانے چراغ، ۱۳۰]

○

"(نقاد) اعلیٰ قدروں کا عارف اور اس کا ناشر ہوتا ہے اس کے لئے ضروری

ہے کہ ہنری جیمس کے الفاظ میں اُس کا کوئی واضح فلسفۂ حیات ہو۔"

[نئے اور پُرانے چراغ، ۱۲]

○

"ہر نقاد کے لئے ایک نظریہ کی بنیاد ضروری ہے۔" [نئے اور پُرانے چراغ، ۱۳۰]

○

"ہر دانشور جو موجودہ میلانات کا مطالعہ کرتا ہے یہ سوچنے پر مجبور رہے کہ وہ اپنا فریضہ تنقید کے ذریعے ہی پُورا کر سکتا ہے۔ یہ تنقید پوری تہذیب کی ہوگی۔ اِس تنقید میں یہ نکتہ بھی ملحوظ رکھنا پڑے گا کہ جمالیاتی اور اخلاقی تنقید عقلیت پر نہیں بلکہ جذبات پر مبنی ہوتی ہے یعنی سماجی حلقے سے متعلق ہوتی ہے۔ اس کے معنی یہ ہوں گے کہ نقاد کو اپنے حلقے کے ذوق کی تربیت کرنی پڑے گی۔ بعض اوقات ذوق بھی پیدا کرنا پڑے گا، یہی تہذیبی تنقید ہوگی۔" [مسرت سے بصیرت تک، ۲۶۴]

○

"تہذیبی تنقید میں ایک اخلاقی اور سماجی وفاداری بھی آجاتی ہے، اِس لیے میرے نزدیک وہ تنقید جو صرف مقررہ اصولوں یا ہیئت کے تجزیے سے سروکار رکھتی ہے ایک بڑے فریضے سے غافل ہو جاتی ہے۔ یہ فریضہ تہذیب کی تنقید کر کے زندگی کے معنی خیز رشتوں کی طرف اشارہ کرنے کا ہے، اور ان رشتوں کی طرف اشارہ کر کے ہی نقاد دانشوری کے حقیقی منصب تک پہنچ سکتا ہے۔" [مسرت سے بصیرت تک، ۲۶۴]

○

"جدید دور میں فن کو تہذیبی تنقید کا فرض انجام دینا ہے۔" [مسرت سے بصیرت تک، ۲۶۵]

○

"فن کار اس بات پر مجبور ہے کہ وہ دُہرا دل ادا کرے، ایک تخلیق کرنے کا اور دوسرا تنقید کرنے کا۔" [مسرت سے بصیرت تک، ۲۶۵]

" فاضل تنقید سے فن پارے کو کوئی فائدہ نہیں ہوتا، کیونکہ تنقید کے اُصول تو تخلیق کے بطن سے ہی برآمد ہوتے ہیں۔" [مسرت سے بصیرت تک، ۲۶۵]

○

" فن تنقیدی کام میں برابر لگا رہتا ہے۔ یہ دُنیا کی تہذیب کا جج ہے اور اُن فلسفوں کے ملبے کو ہٹا دیتا ہے جو فرسودہ ہو گئے ہیں اور ان کی جگہ نئے رشتوں کی دریافت سے کام لیتا ہے۔" [مسرت سے بصیرت تک، ۲۶۵]

○

" مؤثر تنقید، ایک فن پارے کی سی متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔"
[مسرت سے بصیرت تک، ۲۶۵]

○

"ایک صحیح تنقیدی کارنامہ ایک فن پارے کی طرح اس لیے ہے کہ یہ ایک تخلیق ہے جو متاثر کرنے، بدلنے، دنیا پر اثر ڈالنے اور قاری کی نئی ذہنی (ترتیب) کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔" [مسرت سے بصیرت تک، ۲۶۵]

○

" بودلیئر کہتا ہے کہ تنقید کو جانبدار، پُرجوش اور سیّال ہونا چاہیے یعنی اس کا ایک خاص نقطۂ نظر ہونا چاہیے مگر یہ نقطۂ نظر ایسا ہو کہ یہ زیادہ سے زیادہ اُفق روشن کر سکے۔" [مسرت سے بصیرت تک، ۲۶۵]

○

" تنقید کا سُرو کار بہر حال تہذیب سے ہے۔ نقاد اپنے سماج کو زندگی کی ایک واضح شکل دیتا ہے، فن کار انفرادی انسانوں کو بدل دیتا ہے۔ دونوں کا کام یہ ہے کہ اپنے حلقے میں وہ صلاحیت پیدا کریں جس سے عام زندگی، ایک فنکارانہ نظارہ (VISION) بن جائے اور عام تجربہ علامتی معنویت حاصل کر لے۔" [مسرت سے بصیرت تک، ۲۶۶]

ہر شاعری اپنے دور کی زندگی پر تنقید کر کے اُسے اپنے طور پر متاثر کرتی ہے مگر جدید دور میں زندگی پیچیدہ ہو گئی ہے اور براہِ راست تنقید کا کام نثر نے سنبھال لیا ہے۔"

[مسرت سے بصیرت تک، ۲۶۶]

○

"شاعر کا تہذیب کی تنقید کا عمل، دراصل اپنی تہذیب کرنا ہے۔"

[مسرت سے بصیرت تک، ۲۶۶]

○

"آزاد انفرادیت اور بصیرت بالآخر تہذیب اور انسانیت کی خدمت کے لئے ہے۔ یہ تہذیبی تنقید کا فریضہ انجام دے کر انسان کی ذہنی صحت باقی رکھنا چاہتی ہے۔"

[مسرت سے بصیرت تک، ۲۷۲]

○

"نقاد، اچھی صحیح، دل کش، واضح اور پُر کیف نثر نہیں لکھتا تو اس کے خیالات سے متاثر ہونے والے کم ہوں گے۔ اگر وہ کام کی بات کو حسن و خوبی سے بیان کر سکتا ہے تو اس کی اپیل وسیع ہو گی۔" [نئے اور پرانے چراغ، ۱۵]

○

"شاعری اور تنقید دو علیحدہ چیزیں ہیں مگر دونوں میں ایک اہم رشتہ بھی ہے۔"

[نئے اور پرانے چراغ، ۲۰۰]

○

"میں شعر کے نقاد کے لیے شاعر ہونا ضروری نہیں سمجھتا مگر شاعری کے رس بھرے آزار سے واقف ہونا ضروری سمجھتا ہوں۔" [نئے اور پرانے چراغ، ۱۵]

○

"نئی شاعری کیوں ؟ نئی شاعری کیا ؟ نئی شاعری کیسے ؟ تنقید خواہ نئی شاعری کی ہو یا پرانی شاعری کی، انہیں تین سوالوں کے جواب کی کوشش ہوتی ہے۔"

[مسرت سے بصیرت تک، ۲۵۷]

○

"شاعر کیا کہتا ہے، کس طرح کہتا ہے اور کس لیے کہتا ہے ؟ نقد و نظر کی ساری تفصیل کا اجمال یہی ہے۔"

[نئے اور پرانے چراغ، ۱۶۲]

○

"اگرچہ شاعر اپنے کلام کا اچھا نقاد ہو سکتا ہے مگر ایسا ہونا لازمی نہیں ہے۔"

[مسرت سے بصیرت تک، ۱۶۸]

○

"(نقاد) جب تک شعریت اور اس کے لوازم سے پوری طرح آگاہ نہ ہو، اُسے نقاد نہیں کہا جا سکتا۔"

[نئے اور پرانے چراغ، ۲۰۱]

○

"کوئی شاعر اُس وقت تک ترقی نہیں کر سکتا جب تک وہ شعر، شاعری، شعرا کے متعلق شعور نہیں رکھتا۔ نہ کوئی نقاد اس وقت تک اچھا نقاد بن سکتا ہے جب تک وہ شاعر نہ ہوتے ہوئے بھی اُس خیال کو اپنے ذہن میں دوبارہ پیدا نہ کرے جو شاعر کے ذہن میں تھا۔"

[نئے اور پرانے چراغ، ۲۰۱]

○

"کوئی بڑا شاعر ایسا نہیں جو سخن فہم نہ ہو اور وہ سخن فہم جو محض "فن" کا قائل ہے، اُس کے جادو کا قائل نہیں ریاضی داں کہلایا جا سکتا ہے، شاعری کا نقاد نہیں کہا جا سکتا۔"

[نئے اور پرانے چراغ، ۲۰۱]

○

"تحقیق وتنقید (کے) زیادہ صحیح بنیادوں پر ہو سکنے (کے لیے) سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ تمام اساتذہ کے کلام کے مستند اڈیشن دستیاب ہوں۔"

[مسرت سے بصیرت تک، ۱۱]

○

"زبان و بیان کے حسن سے آب و رنگ آ سکتا ہے، روح نہیں آ سکتی۔ پہلی چیز مواد کی صحت یا واقعات کی صداقت ہے۔ اگر نقاد یہ علم نہیں رکھتا یا اس کا علم ناقص ہے تو اس کی بنیادیں ناقص ہیں۔"

[تنقید کیا ہے، ۲۰۴]

○

"(نقاد) کے یہاں اس وسیع ہمدردی کی اُس سمجھدار ذہن کی، اُس ہمہ گیر طبیعت کی موجودگی ضروری ہے، جو شاعر کی فضا میں شاعر کے ساتھ بلکہ اس سے آگے بھی پرواز کر سکے۔"

[تنقید کیا ہے، ۱۹۹]

○

"غزل بڑے ریاض کا ثمرہ ہے، اس پر تنقید بھی ریاض چاہتی ہے۔ یہاں حکم لگانے سے پہلے ذہنی ہمدردی درکار ہے، فیصلے سے پہلے ترجمانی کی ضرورت ہے۔"

[مسرت سے بصیرت تک، ۲۲]

○

"نقاد شاعر نہ ہوتے ہوئے بھی یا اُس پائے کا شاعر ہوتے ہوئے بھی، اچھا نقاد ہو سکتا ہے۔ ہاں اس کے لئے سخن فہم ہونا ضروری ہے۔ اس روح تک پہنچنا ضروری ہے جو شاعر کی ہے۔"

[تنقید کیا ہے، ۱۹۹]

○

"تنقید میں غزل کی روایات کے حسن و قبح کا سوال اتنا اہم نہیں ہے، ان روایات

سے واقفیت ضروری ہے ۔" [مسرت سے بصیرت تک، ۲۲]

O

" نقاد اگر ماہرِ فن نہیں ہے تو اُسے فن پر رائے دینے کا کوئی حق نہیں ۔ ماہرِ فن سے مراد لازمی طور پر شاعر ہونا نہیں ۔ نثر و نظم کی روح سے واقف ہونا اور تخلیق کے اجزا سے آشنا ہونا ہے ۔"
[نئے اور پرانے چراغ ۱۵۰]

O

" کتنے ہی نقاد اب بھی شاعروں اور ادیبوں کا تجزیہ اس طرح کرتے ہیں کہ وہ ان باتوں میں اپنے پیشروؤں سے علیحدہ ہیں ۔' یہ ٹھیک ہے مگر ناکافی ہے ۔"
[تنقید کیا ہے ۲۰۵]

O

" شاعروں اور ادیبوں کا تجزیہ (کرتے ہوئے) ... یہ دیکھنا چاہیے کہ وہ کس حد تک ..... نئے اور کس حد تک پرانے ہیں اور یہی نہیں، اُن کے نئے پن میں کس حد تک پرانا پن ہے ۔"
[تنقید کیا ہے، ۲۰۵]

O

شاعروں اور ادیبوں کا تجزیہ (کرتے ہوئے) ..... یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ وہ کس حد تک اُس سرمائے کے امین، اُس روایت کے آئینہ دار، اور اس مزاج کے مظہر ہیں جو تہذیب و تمدن نے دیا ہے ۔"
[تنقید کیا ہے، ۲۰۵]

O

"کسی شاعر پر تنقید کے لیے سب سے اہم اُس کا کلام ہے، اس کے علاوہ شاعر کے حالاتِ زندگی، اُس کی شخصیت کے نمایاں پہلو، اس کے ماحول، اس سے پہلے کی شاعری کے اسالیب کو ذہن میں رکھنا پڑتا ہے ۔"
[مسرت سے بصیرت تک، ۱۲]

O

"شاعروں اور ادیبوں کی قدر و قیمت کا اندازہ محض ان کی جدت و ندرت سے نہیں، ان کی ادبیت سے بھی کرنا چاہیے اور ادبیت سے یہاں مراد اس ادبی معیار سے ہے جو اس عرصے میں بن سکا ہے۔" [تنقید کیا ہے، ۲۰۵]

○

"ناول، افسانے، ڈرامے، طنز و مزاح پر تنقید کے لئے خود ناول وغیرہ لکھنا ضروری نہیں، اس بحر کا شناور ہونا ضروری ہے۔ اس کا گہرا علم اور اس کے رمز و ایما پر پوری نظر لازمی ہے۔" [نئے اور پرانے چراغ، ۱۵]

○

"اگر نقاد مصنف کو یہ موقع دیتا ہے کہ وہ اس کی آواز سے بولے اور اس کے قلم سے لکھے، اسے تھوڑی دیر کے لئے اپنے اندر سما جانے دے اور اس طرح اُس کے ساتھ انصاف کرے تو وہ اچھا نقاد ہے۔" [تنقید کیا ہے، ۲۱۳]

○

"اچھا نقاد پڑھنے والے کو شاعر سے شاعری کی طرف لے جاتا ہے، معمولی نقاد شاعری میں اُلجھ کر رہ جاتا ہے۔" [تنقید کیا ہے، ۲۱۵]

○

"ہماری تنقید اب تک ادب کے کسی نہ کسی پابند تصور سے آزاد نہیں ہو سکی ہے گو حال ہی میں اس تصور سے بلندی اور ادب کی اپنی خصوصیت کو واضح کرنے کی کوششیں ملنے لگی ہیں۔" [مسرت سے بصیرت تک، ۱۴۵]

○

"ایک اچھا نقاد کسی ایک معیار یا پیمانے پر قناعت نہیں کرتا۔ وہ کئی چیزوں کو دیکھتا ہے۔ کتنے نقاب اُسے اُٹھانے پڑتے ہیں تب جا کر حقیقت کا جلوہ

نظر آتا ہے۔" [تنقیدی اشارے، ۶۲]

○

"تنقید میں .... تقلیدی رنگ ..... ادب کی ترقی کے لئے مضر ہے۔"
[مسرت سے بصیرت تک، ۱۲۰]

○

"فن کار تجربوں کو جنم دیتا ہے، سخن فہم نقاد فن کاروں کو صحیح معنی میں 'فن کار' بناتا ہے۔" [تنقید کیا ہے، ۱۹۰]

○

"اچھے نقادوں کی فہرست پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ کچھ نقاد فیصلے کی طرف مائل رہے ہیں، کچھ تجزیے اور تحلیل پر زور دیتے رہے ہیں۔ کچھ ترجمانی کا حق ادا کرتے رہے ہیں اور غیر جانبداری کی کوشش کرتے رہے مگر ادب میں مستقل غیر جانبداری مشکل ہی نہیں قریب قریب ناممکن ہے۔" [تنقید کیا ہے، ۲۰۳]

○

"فاعلاتن فاعلات کی گردان اگرچہ تنقید نہیں ہے مگر اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ کوئی بھی اچھا نقاد عروض اور اس کے قواعد سے بے نیاز ہو سکتا ہے۔"
[تنقید کیا ہے، ۲۰۳]

○

"ادب کا اچھا نقاد زبان کا بھی اچھا نباض ہوتا ہے۔ وہ نہ صرف عروض، روزمرہ، اور محاورے سے واقف ہوتا ہے بلکہ یہ بھی جانتا ہے کہ بعض اوقات ان کی فروگذاشت کے باوجود اچھی اور بڑی شاعری ممکن ہے۔" [تنقید کیا ہے، ۲۰۳]

○

"حیات آفریں، معنی خیز اور مقصدی ادب کو ہمارے سماجی نظام میں وہ درجہ حاصل نہیں ہوا جس کا وہ مستحق ہے۔ ادب کو یہ درجہ دلانا ایک اچھے نقاد کا کام ہے۔"

[نئے اور پرانے چراغ، ۱۲]

○

"ہر اچھے نقاد کے لئے پرانے پن کی طرح ..... نئے پن کا احترام بھی ضروری ہے۔"

[تنقید کیا ہے، ۲۰۷]

○

"حریتِ فکر اور آزادیٔ رائے ادب اور تنقید دونوں کے لئے ضروری ہے۔"

[مسرت سے بصیرت تک، ۶۷]

○

"ادب (کی) کثرت میں وحدت اُسی وقت نظر آئے گی جب پرکھنے والے کی نظر میں وحدت ہوگی۔ ایک اچھے نقاد کے لئے اس وحدت کے باوجود کثرت کے حُسن کو پہچاننا اور مختلف اصناف، اشخاص یا اداروں کے ساتھ انصاف کرنا ناممکن نہیں۔"

[نئے اور پرانے چراغ، ۱۳]

○

"جس طرح میر کے خیالات کے مطابق انسان فلک کے برسوں پھرنے کے بعد وجود میں آتا ہے۔ اسی طرح اچھا نقاد بھی بڑی مشکل سے پیدا ہوتا ہے۔"

[تنقید کیا ہے، ۱۳۸]

○

"ہمارے نوجوان ..... تحسین و تنقید کے فن کو نہیں پہچانتے اور تنقید کی تخلیقی و تعمیری قوتوں سے ناواقف ہیں۔"

[تنقید کیا ہے، ۱۳۸]

○

"جدید تنقید پر تحسین کا دور پوری طرح نہیں گزرا۔ تحسین سب کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی تنقید کی دنیا میں بہت کچھ ہے۔" [مسرت سے بصیرت تک، ۶۷، ۶۹]

○

"تنقید کو دوسرے درجے کی چیز سمجھنا ایک بہت بڑی غلطی ہے۔"
[تنقید کیا ہے، ۹۹]

○

"تنقیدی شعور، تخلیقی شعور کے ساتھ ساتھ چلتا ہے۔" [مسرت سے بصیرت تک، ۲۱]

○

"ہڈسن نے صاف صاف کہا ہے کہ: سچی تنقید بھی چونکہ اپنا مواد اور جذبہ زندگی سے لیتی ہے اس لئے اپنے رنگ میں وہ بھی تخلیق ہے۔" [تنقید کیا ہے، ۱۹۹]

○

"تنقیدی ادب سے اس وجہ سے بھڑکنا کہ وہ "کتابوں کی مہک" رکھتا ہے، صحیح نہیں۔ اچھی تنقید کسی طرح اچھی تخلیق سے کم نہیں بلکہ بعض وجوہ سے اس پر فوقیت رکھتی ہے۔" [تنقید کیا ہے، ۱۹۹]

○

"تنقیدی کارنامے ہر دور میں تخلیقی کارناموں کے پیچھے چلے ہیں۔"
[مسرت سے بصیرت تک، ۲۱]

○

"جس گہرائی اور سپردگی کی تخلیق میں ضرورت ہوتی ہے، تنقید میں اس سے ابھرنا بھی ہوتا ہے۔" [تنقید کیا ہے، ۱۹۸]

○

"تنقید، تخلیق کی باز آفرینی ہی نہیں ہے، باز آفرینی بھی ہے۔"

[مسرت سے بصیرت تک، ۶۷]

○

"تنقید کی طرف سے بدگمانی عام طور پر ان لوگوں کو ہوتی ہے جو ادب کو بہت گہری نظر سے دیکھنے کے عادی نہیں ہیں، جو اس میں صرف تفریح، یا اقبال کے الفاظ میں کوکنار کی لذت ڈھونڈتے ہیں۔ اگر وہ سطحی فرق کو نظر انداز کر دیں اور غور کریں تو انھیں معلوم ہو جائے کہ تخلیقی ادب کی زندگی کے لئے کتنا ضروری ہے کہ وہ تنقیدوں سے مدد لے۔"

[تنقید کیا ہے، ۱۹۶]

○

"بڑی تنقید، تخلیقی ادب سے کسی طرح کمتر نہیں ہوتی بلکہ وہ خود تخلیق ہو جاتی ہے۔"

[تنقید کیا ہے، ۱۹۷]

○

"تنقید ذہن میں روشنی کرتی ہے اور یہ روشنی اتنی ضروری ہے کہ بعض اوقات اس کی عدم موجودگی میں تخلیقی جوہر میں کسی شے کی کمی محسوس ہوتی ہے۔"

[تنقید کیا ہے، ۱۹۹]

○

"تنقید تخلیق پر عمل جراحی بھی کرتی ہے مگر یہ عمل شاعرانہ طور پر ہوتا ہے اور اسی فضا کے اندر رونما ہوتا ہے۔" [تنقید کیا ہے، ۱۹۶]

○

"تنقید، خلاصہ یا تنقیص نہیں ہے مگر اس کا تخلیق کے بنیادی خیال تک پہنچنا ضروری ہے۔" [تنقید کیا ہے، ۱۹۶]

○

"تخلیقی ادب میں تنقیدی شعور کی کارفرمائی ہوتی ہے، تنقید اس کو واضح کر دیتی ہے۔"

[تنقید کیا ہے، ۱۹۶]

○

"اچھی تنقید، تخلیقی ادب کی طرف مائل کرتی ہے، وہ خود تخلیق ہوتی ہے۔"

[تنقید کیا ہے، ۱۹۶]

○

"تخلیقی ادب پر کوئی تنقید، تخلیقی ادب سے بے نیاز نہیں کر سکتی۔ دونوں کے درمیان کوئی خلیج نہیں ہے۔"

[تنقید کیا ہے، ۱۹۶]

○

"تخلیقی جوہر بغیر تنقیدی شعور کے گمراہ ہو جاتا ہے اور تنقیدی شعور بغیر تخلیقی استعداد کے بے جان رہتا ہے۔"

[تنقید کیا ہے، ۱۸۹]

○

"تخلیقی کارنامے بغیر ایک اچھے تنقیدی شعور کے وجود میں نہیں آ سکتے۔"

[تنقید کیا ہے، ۱۸۹]

○

"تخلیقی ادب میں تو نظریہ، تخلیق کے آداب کے مطابق ہی آ سکتا ہے مگر تنقید میں براہِ راست اس کا احساس ضروری ہو گیا ہے۔"

[ادب اور نظریہ، ۲۸۲]

○

"ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ نے غلط نہیں کہا ہے کہ: جب ایک تخلیقی ذہن دوسرے سے بہتر ہوتا ہے تو اکثر اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ جو بہتر ہوتا ہے وہ تنقیدی صلاحیت زیادہ رکھتا ہے۔"

[تنقید کیا ہے، ۱۹۹]

○

"سائنسی تنقید سے صرف سائنسی تجربہ مُراد لینا چاہیے تاکہ تنقید کو تأثراتی اور تخیلی دھاروں کے سیلاب سے بچایا جاسکے اور جذبات کے غبارِ رنگیں پر فکرِ روشن کی کرن کے ساتھ اس میں معیاری اور فروعی مسائل کا احساسِ فکر و فن کے باہمی ربط اور دونوں کے رشتے کا مجموعی اثر نتیجہ خیز تجربات کی پرکھ اور اس طرح قدروں کی دریافت اور اشاعت ضروری ہونی چاہیے۔" [ادب اور نظریہ، ۲۸۳]

"تنقید کو سائنسی طریقۂ کار سے فائدہ اُٹھانا چاہیے۔ اس میں تنظیم اور موزونی آجاتی ہے، مگر وہ سائنس نہیں ہے۔" [ادب اور نظریہ، ۷]

"تنقید کو سائنسی ہونا چاہیے مگر اسے سائنس کے ہاتھوں میں کھلونا بنانا ادب کے ساتھ ایک غداری ہوگی۔ وہ صرف سائنسی طریقِ کار سے فائدہ اُٹھائے گی مگر سائنسی تحریر نہ ہوگی۔ وہ صرف معلومات عطا نہ کرے گی، گو ارا معلومات کا خزانہ بھی ہوگی۔" [ادب اور نظریہ ۲۸۴]

"تنقید سائنسی طریقِ کار سے فائدہ اُٹھا سکتی ہے اور اسے اُٹھانا چاہیے مگر یہ بہرحال ادب کی ایک صنف ہے۔" [نئے اور پرانے چراغ، ۱۴]

"تنقید، ادبی اسالیب کو نظرانداز نہیں کرسکتی۔" [ادب اور نظریہ، ۸]

"ایسی تنقید سے کیا فائدہ جسے پڑھ کر سر میں درد ہونے لگے جو اپنی زبان و ادب کے رنگ و آہنگ سے بیگانہ ہو، جس میں خیالات کی لطیف پھوار نہ ہو بلکہ

گولہ باری ہو۔"

[ادب اور نظریہ، ۸۰]

○

"تنقید اگر تمام تر عقل ہوگی اور اُس نے آدابِ عشق کو نظر انداز کر دیا تو وہ ادبی تنقید نہ رہے گی، علمی صحیفہ ہو جائے گی۔"

[ادب اور نظریہ، ۴۸]

○

"اگر تنقید میں ادبیت نہیں ہے تو اس کا اثر کم ہو جائے گا۔ ادبیت کے معنی محض شاعرانہ رنگینی کے نہیں ہیں، نہ مبالغہ آمیز زبان کے، نہ خطابت یا تبلیغ کے۔ ادبی زبان کے معنی انشاپردازی کے رکھ رکھاؤ کو برتنے کے ہیں۔"

[نئے اور پرانے چراغ، ۱۴]

○

"خیال بندی و خیال آفرینی بہت اچھی چیز ہے مگر جب آدمی اس کے پھیر میں پڑ جاتا ہے تو کسی کام کا نہیں رہتا۔"

[تنقیدی اشارے، ۱۴۸]

○

"تنقید کو ابھی اور سائنٹفک ہونا ہے اور اس کے لیے اسے اور زیادہ نظریاتی بننا ہے۔"

[ادب اور نظریہ، ۲۸۲]

○

"ہر نئی دریافت کو اُس کی مناسب جگہ دینا، ہر نئے سچ کو زندگی کی بڑی صداقت کے سانچے میں سمونا، جھوٹ کو پہچاننا، جب وہ سچ کا قالب پہن کر سامنے آئے اور بھی ضروری ہو جاتا ہے۔ گویا تنقید ادیبوں، ادب سے مسرت اور خیر و برکت حاصل کرنے والوں اور خود ادب کے لئے ایک مشعلِ ہدایت ہے۔"

[تنقید کیا ہے، ۲۰۲]

○

"تنقید اس خوشی کو جو ہمیں ادب سے حاصل ہوتی ہے، نشاطِ زندگی کا ایک وسیلہ بناتی ہے۔"
[تنقید کیا ہے، ۲۰۲]

o

"تنقید ادب میں حسن، مادی زندگی کے حسن کا بہتر احساس دیتی ہے اور اس طرح زندگی کی ایک طاقت بن جاتی ہے۔"
[تنقید کیا ہے، ۲۰۲]

o

"محدود تنقید تو خیر محدود قسم کی ہوتی ہے، زیادہ مضر نہیں ہوتی لیکن وہ تنقید جس میں دعویٰ جامعیت کا کیا جائے مگر ہو محدود اور مخصوص، گمراہ کن اور پُر فریب ہے۔"
[تنقید کیا ہے، ۱۹۷]

o

"میں نفسیاتی شعور کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے، سستی نفسیاتی تنقید کو گمراہ کن سمجھتا ہوں۔"
[تنقید کیا ہے، ۲۱۱]

o

"تنقید نفسیات کی دلدل میں گرفتار نہیں ہو سکتی۔ نفسیات کا علم ہمارے لیے بڑا مفید ہے مگر وہ پُر فریب بھی ہے۔"
[تنقید کیا ہے، ۲۱۰]

o

"نفسیاتی تنقید زیادہ تر شخصیت کی بھول بھلیوں میں کوئی راستہ تلاش کرتی ہے۔"
[تنقیدی اشارے، ۲۱۴]

o

"اردو میں نفسیاتی تنقید نے ابھی بلوغت کی منزل طے نہیں کی۔ اس کی افادیت میں کلام نہیں، مگر اسے سب کچھ نہ سمجھنا چاہیے۔"
[تنقیدی اشارے، ۲۱۴]

o

"نفسیاتی تنقید، سائنس ہونے کا دعویٰ کرتی ہے اور سائنس سے بعض حربے مستعار بھی لیتی ہے، مگر ابھی سائنس نہیں بن سکی۔" [تنقید کیا ہے، ۲۱۰]

○

"نفسیاتی تنقید میں خارجیت ہونی چاہیے یعنی فن کار کی نفسیات کو سائنٹفک طریقے سے سمجھنا چاہیے محض اپنے ذوق کی چیزیں نہ ڈھونڈنی چاہئیں۔"
[تنقیدی اشارے، ۲۱۴]

○

"نفسیاتی تنقید، ہلدی کی گرہ لے کر پنساری بن بیٹھتی ہے۔" [تنقید کیا ہے، ۲۱۰]

○

"مارکسی تنقید کا دائرہ، نفسیاتی تنقید سے زیادہ وسیع ہے۔" [تنقیدی اشارے، ۲۱۵]

○

"مارکسی تنقید کے مطابق مادی زندگی میں پیداوار کے طریقے اجتماعی، سیاسی اور ذہنی زندگی کے رجحانات کو متعین کرتے ہیں۔" [تنقیدی اشارے، ۲۱۵]

○

"مارکسی تنقید کے مطابق، احساس اور شعور بھی اجتماعی زندگی سے بنتا ہے اور حسن کے نظریے اقتصادی نظریوں کا اثر قبول کرتے ہیں۔" [تنقیدی اشارے، ۲۱۵]

○

"مارکسی تنقید کے اثر سے ہماری تنقید میں سائنٹفک اور علمی رنگ، زندگی اور اس کی تاریخ کا علم، کائنات کی تبدیلیوں کا احساس اور انسانیت کے مستقبل سے محبت آئی ہے۔" [تنقیدی اشارے، ۲۱۵]

○

"یہ غلط ہے کہ مارکسی تنقید، ماضی کو نظر انداز کرتی ہے اور مغرب کی نقالی پر مبنی ہے۔" [تنقیدی اشارے، ۲۱۵]

○

"مشرق و مغرب کی تقسیم ہمارے یہاں ایک ذہنی کجی کا باعث بن گئی ہے۔ مارکسی تنقید نے اس کجی کو واضح کرکے ادیب پر ایک احسان کیا ہے۔" [تنقیدی اشارے، ۲۱۵]

○

"مارکسی تنقید، ادب کو چند خود ساختہ دیوتاؤں کے ہاتھ میں دینے کے بجائے عام لوگوں کی دولت بنانا چاہتی ہے۔ ابھی اردو میں یہ تنقید عام نہیں ہوئی مگر اس کا اثر ہونے لگا ہے جو ایک اچھا شگون ہے۔"

[تنقیدی اشارے، ۲۱۶]

○

"لفظی تنقید بھی تنقید کی معمولی قسم ہے۔ الفاظ کے اندر فن کا جو شعور ہے اور فن میں حیات و کائنات کا جو احساس ہے وہ زیادہ ضروری ہے۔" [تنقید کیا ہے، ۲۰۳]

○

"قدیم تنقید ہر شاعر کو علیحدہ علیحدہ دیکھتی ہے۔" [تنقید کیا ہے، ۲۰۹]

○

"قدیم تنقید میں... ذاتی حالات اور شخصی تجربات کا تذکرہ ہوتا تھا شخصیت کا بھی احساس موجود تھا مگر ماحول کس حد تک تخلیقی کارناموں کو متاثر کرتا ہے شخصیت میں کیسے چھپ کر ظاہر ہوتا ہے، کیسے کیسے عجیب و غریب راستوں سے فن میں راہ پاتا ہے، اس کی اُسے خبر نہ تھی۔" [تنقید کیا ہے، ۲۰۹]

○

"میں داخلی تنقید کو ناقص تنقید کہتا ہوں۔ وہ تحسین (APPRECIATION) کے درجے میں آتی ہے۔ اس کی علیحدہ قدر و قیمت ہے مگر اسے بڑی تنقید کا درجہ نہیں مل سکتا۔"
[تنقید کیا ہے، ۱۹۷]

○

"تنقید میں بھی جوش اور جذبے کی ضرورت ہے مگر بڑی تنقید محض جوشیلی یا جذباتی ہوتی ہے۔"
[تنقید کیا ہے، ۲۱۴]

○

"جدید تنقید نے خارجیت، واقعیت، سماجی شعور، تہذیبی تنقید جیسی اصطلاحوں تک رہنمائی کی ہے۔"
[تنقید کیا ہے، ۲۰۹]

○

"تنقید کو سیاست کی غلامی نہیں کرنی چاہیے، سیاست کا ساتھ دینا چاہیے، اس کی رفاقت کرنی چاہیے۔"
[تنقید کیا ہے، ۲۱۰]

○

"میں نظریاتی تنقید کا حامی ہوں مگر اس کے ساتھ ساتھ یہ کہنا ضروری سمجھتا ہوں کہ ادب اور سائنس میں ایک فرق لازمی طور پر ذہن میں رکھنا ہوگا۔" [ادب اور نظریہ، ۲۰۴]

○

"ترقی پسند تحریک نے تنقیدی شعور کی تہذیب میں حصہ لیا ہے اور ہر تخلیقی کارنامے میں ایک واضح تنقیدی شعور پر اصرار کیا ہے۔"
[تنقیدی اشارے، ۲۱۰]

○

"ترقی پسند تحریک کا سب سے بڑا کارنامہ تنقید ہے۔" [تنقیدی اشارے، ۲۱۰]

○

"ترقی پسند تحریک کا دوسرا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے تنقید کو ادب میں اس کا صحیح منصب عطا کیا ہے۔" [تنقیدی اشارے، ۲۱۰]

O

"ہماری تنقید میں، ترقی پسند تنقید کا کارنامہ سب سے زیادہ وقیع اور عظیم الشان ہے۔" [تنقید کیا ہے، ۱۷۷]

O

"ترقی پسند تنقید نے لوگوں کو تنقید کے مطالعہ کا شوق دلایا ہے اور آج لوگ تنقیدیں بھی ذوق و شوق سے پڑھنے لگے ہیں۔ اس نے تنقید کو محض لفظی یا صنعتی یا شعبدہ باز ہونے سے بچایا ہے۔ اصطلاحوں کے چکر سے یہ بھی ابھی آزاد نہیں ہو سکی ہے۔ ماحول اور زمانے کی خاطر اب بھی کبھی کبھی یہ شخصی اور ذاتی اور انفرادی خصوصیات کو نظر انداز کر دیتی ہے، مگر اس نے تحسین اور سخن فہمی کا معیار اونچا کیا ہے، اس نے غزل کی مقبولیت کو کم کیا ہے اور غزل کے معیار کو بلند اور شاعروں اور ادیبوں سے بعض مطالبے کر کے اور ان سے توقعات وابستہ کر کے، انھیں سوچنے اور سمجھنے اور سوچتے اور سمجھتے رہنے پر مجبور کر دیا ہے۔ اس نے ادب میں آمریت کی بجائے جمہوریت کی ہے۔ اس نے زبان کے مسئلے کو سیاست کی الجھنوں سے علیحدہ کر کے سماجی اور علمی نقطۂ نظر سے دیکھنے کی کوشش کی ہے، اس نے آزاد نظم، بے قافیہ نظم اور اسی قسم کے دوسرے تجربوں کے لیے میدان صاف کیا ہے۔ اس نے شہر تیں بنائی اور بگاڑی ہیں۔ اس نے ہمارے ادب کو عصریت اور ارضیت عطا کی ہے اور ماضی کی نئی پہچان میں بھی حصہ لیا ہے اس نے تجربے اور تجربے میں فرق کرنا سکھایا ہے۔ اس نے تنقید کو تجربہ یا عیب جوئی یا نکتہ چینی نہیں ہونے دیا۔ اس نے بتایا ہے کہ تنقید محض گلستان میں کانٹوں کی تلاش نہیں ہے بلکہ کانٹوں کے باوجود اس کی بہار کا احساس دیکھنے کی کوشش ہے۔ یہ تنقید ذہنی صحت کا معیار قائم

کرتی ہے اور تجربے کی قدر و قیمت متعین کرتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ذہنی سمت کا اجارہ صرف ترقی پسندوں نے نہیں لیا اور دوسروں کے یہاں بھی یہ چیز جلوہ گر ہے اور حال میں نفسیاتی تنقید کی بھی اچھی مثالیں ملتی ہیں مگر اب تک ہماری تنقید میں ترقی پسند تنقید کا کارنامہ سب سے زیادہ وقیع اور عظیم الشان ہے۔" [تنقید کیا ہے، ص ۱۷۶ و بعد]

○

"ترقی پسند تنقید شروع میں ذرا سطحی قسم کی تھی۔ بڑی رعونت رکھتی تھی۔ ہر پرانی چیز سے گریز کرتی تھی ہر نئی چیز سے محبت، اس لیے کہ وہ نئی ہے۔" [تنقیدی اشارے، ۲۱۱]

○

"ترقی پسند تنقید نے تنقید کے مفہوم کو وسیع کیا روایات اور تجربات کا فرق سمجھایا اور اپنے ادبی سرمائے کے قابلِ قدر حصے کا احساس دلاتے ہوئے اسے آج کی زندگی کے بامعنی نتیجہ خیز اور وقیع حقائق کا آئینہ دار بنایا۔" [ادب اور نظریہ، ۶]

○

"ترقی پسند تنقید شروع میں تبلیغ زیادہ تھی تنقید کم۔ اس لیے کہ ماضی کی قدر کرنا اس نے اس وقت تک نہ سیکھا تھا مگر اب جو تنقیدیں لکھی جا رہی ہیں ان میں تاریخی شعور تسلسل کا لحاظ اور ماضی کا صحیح احساس ملتا ہے۔" [تنقید کیا ہے، ۲۰۵]

○

"تنقید کی اہمیت کو ظاہر کرکے اور تنقید کو اعلیٰ ترین ادب قرار دے کر ادر تنقید کے ذریعے سے منفرد ادبی کارناموں میں ایک مسلسل تصورِ حیات دیکھنے کی کوشش کرکے ترقی پسند تحریک نے ادب کو بڑے فائدے پہنچائے ہیں۔" [تنقیدی اشارے، ۲۱۰]

○

"ایک خیال یا نظریے سے ہمدردی رکھتے ہوئے بھی نقاد اور ادیب کو آفاقی ہونا

چاہیے۔ صحیح ترقی پسندی یہی ہے۔" [تنقید کیا ہے، ۱۴]

○

"حالی کے الفاظ میں اچھی تنقید حیرت انگیز جلووں کا پتہ لگاتی ہے۔"
[تنقید کیا ہے، ۲۱۴]

○

"ہر اچھی تنقید ادب کی بقا اور ترقی کے لئے کچھ سماجی، اخلاقی اور جمالیاتی قدروں پر زور دیتی ہے۔" [ادب اور نظریہ، ۷]

○

"اچھی تنقید کے لئے انسانیت اور تہذیب کا ایک جامع شعور درکار ہے۔"
[ادب اور نظریہ، ۷]

○

"اچھی تنقید میں جذبے کو ایک نازک، پختہ اور مہذب احساس کا نکھار مل جاتا ہے۔"
[تنقید کیا ہے، ۲۱۴]

○

"اچھی تنقید محض تخریبی نہیں ہوتی، محض خامیوں یا کوتاہیوں کو نہیں دیکھتی، وہ بلندیوں کو دیکھتی ہے اور یہ اندازہ لگاتی ہے کہ یہ بلندی کیسی ہے۔" [تنقید کیا ہے، ۲۱۴]

○

"اچھی تنقید پستی کا احساس رکھتی ہے مگر پست نہیں ہوتی۔"
[تنقید کیا ہے، ۲۱۴]

○

"اچھی تنقید پڑھنے والے کے ذہن پر مہر نہیں لگاتی، اس کے ذہن کی تربیت

کرتی ہے۔"

[تنقید کیا ہے، ۱۹۶]

○

"اچھی تنقید کے لئے جمالیاتی قدروں اور زبان و بیان کے اسالیب کا گہرا علم بھی...
... درکار ہے۔"

[ادب اور نظریہ، ۵]

○

"اچھی تنقید کے لئے سماجی رشتوں، انسانی تاریخ، نفسیات اور تہذیبی کارناموں کا علم ضروری ہے۔"

[ادب اور نظریہ، ۵]

○

"اچھی تنقید نہ صرف واضح معلومات عطا کرتی ہے بلکہ ایک خوشگوار احساس بھی بخشتی ہے۔ ادب میں مسرت اور بصیرت دونوں کا احساس ضروری ہے۔"

[ادب اور نظریہ، ۵]

○

"اچھی تنقید کی قدریں مہذب انسانیت کی قدریں ہی ہوتی ہیں۔"

[ادب اور نظریہ، ۵]

○

"اچھی تنقید محض معلومات ہی فراہم نہیں کرتی بلکہ وہ سب کام کرتی ہے جو ایک مؤرخ، ماہرِ نفسیات، ایک شاعر اور ایک پیغمبر کرتا ہے۔" [تنقید کیا ہے، ۱۹۹]

○

"اچھی تنقید محض کلاسیکی یا رومانی کے پھیر میں نہیں پڑ سکتی، وہ اس طرح خانوں میں نہیں بٹ سکتی۔"

[تنقید کیا ہے، ۲۰۵]

○

Hasnain Sialvi



"تنقید کے مفہوم، منصب، اس کی ضرورت، اس کی بنیادی شرائط، اس کے میدان اور خصوصیات کے متعلق آج بھی بہت سی غلط فہمیاں ہیں، اس لئے یہ واضح کرنے کی اب بھی بڑی ضرورت ہے کہ تنقید کیا ہے اور ادب اور زندگی میں اس کی کیا اہمیت ہے۔" [تنقید کیا ہے، ۱۹۱]

○

"ہر تنقید ایک ذہنی سفر کا آغاز ہے۔" [تنقید کیا ہے، ۲۱۳]

○

"تنقید ہوا نہیں ہو سکتی۔ اقتباسات تنقید کو صحت سے زیادہ قریب رکھتے ہیں۔" [تنقید کیا ہے، ۱۹۴]

○

"تنقید نہ وکالت ہے نہ عدالتی فیصلہ، یہ پرکھ ہے۔" [ادب اور نظریہ، ۷]

○

"تنقید کے متعلق یہ تصور کہ وہ شاعر یا ادیب کے خیالات کی باز آفرینی ہے کافی فرسودہ ہو چکا ہے۔ رچرڈس کا یہ قول اس سلسلے میں زیادہ مفید ہے کہ یہ تجربات کی پرکھ اور قدروں کے تعین کا نام ہے۔" [ادب اور نظریہ، ۲۸۲]

○

"تنقید ایک کشکول نہیں ہے جس میں ادھر ادھر سے ٹکڑے جمع کر کے پیش کر دیئے جائیں، نہ یہ دوسروں کے اقوال کو ایک خاص انداز سے یکجا کر کے سستی مغربیت یا نام نہاد مشرقیت کا علم بلند کرنے کا دوسرا نام ہے۔" [تنقید کیا ہے، ۱۳۷]

○

"تنقید یہ بتاتی ہے کہ آپ میوہ فروش کے پیمانے سے سونا نہیں تول سکتے۔" [تنقید کیا ہے، ۱۵]

○

"تنقید وضاحت ہے، تجزیہ ہے۔" [تنقید کیا ہے، ۲۰۲]

○

"تنقید کا کام گلستان میں کانٹوں کی تلاش نہیں ہے۔" [ادب اور نظریہ، ۲۲]

○

"تنقید خوردہ گیری یا سخن چینی نہیں ہے۔" [تنقید کیا ہے، ۳۷]

○

"تنقید کوئی عدالتی فیصلہ یا ہر شاعر کا درجہ متعین کرنے کے لئے کوئی فارمولا نہیں ہے۔"
[تنقید کیا ہے، ۳۷]

○

"تنقید جزو سے کل پر حکم لگانا نہیں ہے۔" [تنقید کیا ہے، ۳۷]

○

"تنقید محض تصویر کے دونوں رُخ دکھانے کا نام نہیں ہے، نہ اس میں آدمی خفا ہے یا مصالحت کی کوشش کرتا ہے اور محض "عیش نیز بگو" سے عہدہ برآ ہوتا ہے بلکہ دونوں پہلوؤں میں نظر رکھنے کے بعد کسی کی اہمیت کا اعتراف ضروری ہے۔"
[تنقید کیا ہے، ۲۰۳]

○

"تنقید ہرگز مسل بندی یا واقعات کی کھتونی نہیں ہے مگر واقعات کے صحیح بیان اور صحیح احساس کے بغیر، یعنی صحیح تاریخی شعور کے بغیر اس کا ہر قدم اسے ترکستان کی طرف لے جائے گا۔" [تنقید کیا ہے، ۲۰۴]

○

"تنقید میں بڑی اہمیت اس تجربے کی ہے جو شاعر یا ادیب کا ہے.....

اہمیت رکھتے ہیں ۔" [تنقید کیا ہے، ۱۷۵]

○

"انتخاب تنقید تو نہیں ہے مگر انتخاب سے تنقیدی شعور ضرور ظاہر ہوتا ہے ۔"
[تنقید کیا ہے، ۱۹۴]

○

"تنقید کے لئے ایک مقدّس سنجیدگی کی ضرورت ہوتی ہے ۔ آرنلڈ نے اس کو HIGH SERIOUSNESS کہا ہے ۔" [تنقید کیا ہے، ۱۹۸]

○

"تنقید میں روایت اور بغاوت، ماضی، حال ماحول اور انفرادیت، فن اور فلسفے میں توازن قائم کرنا ہوتا ہے ۔" [تنقید کیا ہے، ۲۱۱]

○

"تنقید کا مقصد روایات کا احساس، تجربات کی پرکھ اور قدروں کا تعین ہے ۔"
[ادب اور نظریہ، ۳۲]

○

"تنقید انصاف کرتی ہے ادنیٰ اور اعلیٰ، جھوٹ اور سچ اور پست اور بلند کے معیار کو قائم کرتی ہے ۔" [تنقید کیا ہے، ۲۰۲]

○

"تنقید قدریں متعین کرتی ہے ادب اور زندگی کو ایک پیمانہ دیتی ہے ۔"
[تنقید کیا ہے، ۲۰۲]

○

"تنقید دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کر دیتی ہے ۔" [تنقید کیا ہے، ۲۰۲]

○

"تنقید کا کام فیصلہ ہے۔" [تنقید کیا ہے، ۲۰۲]

○

"تنقید ادب میں ایجاد کرنے اور محفوظ رکھنے دونوں کا کام انجام دیتی ہے، وہ بت شکنی بھی کرتی ہے اور بت گری بھی۔" [تنقید کیا ہے، ۲۰۲]

○

"تنقید کے بغیر ادب ایک ایسا جنگل ہے جس میں پیداوار کی کثرت ہے، موزونیت اور قرینے کا پتہ نہیں۔" [تنقید کیا ہے، ۲۰۲]

○

"تنقید کا کام غور و فکر کی دعوت دینا ہے، کسی حلقے کی تعداد بڑھانی یا برادری اکٹھا کرنا نہیں۔" [نئے اور پرانے چراغ، ۱۴]

○

"تنقید کا کام ..... فن کار کی شخصیت کو سمجھنا ہے، اس کے اپنے تجربات کا تجزیہ کرنا ہے، پھر اس کے عناصر کو ماحول کی روشنی میں دیکھنا ہے۔ تب جا کر صحیح ادبی بصیرت حاصل ہو سکتی ہے۔" [تنقید کیا ہے، ۲۰۹]

○

"تذکروں کی تنقید بیشتر تعارف، تحسین یا تنقیص سے آگے نہیں بڑھتی۔" [مسرت سے بصیرت تک، ۱۵]

○

"ہماری مشرقی تنقید ہمارے تہذیبی تصور کا عطیہ ہے جس میں جاگیردارانہ دور کی تمام خصوصیات جلوہ گر ہیں۔" [مسرت سے بصیرت تک، ۲۱]

○

"ہماری مشرقی تنقید کا تہذیبی تصوّر شہروں اور ان کی ایک مخصوص تہاہی تک محدود تھا۔" [مسرّت سے بصیرت تک، ۲۱]

O

"ہمارے تذکرے اور تنقید، زبان اور فن کے خواص پسند تصوّر سے عرصے تک آزاد نہ ہوسکے۔" [مسرّت سے بصیرت تک، ۲۱]

O

"اُردو زبان سے ناواقف ہوتے ہوئے تنقید کے میدان میں اُترنا، ریت پر عمارت بنانا ہے۔ زبان سے واقفیت کے بعد زبان کی ادبی تاریخ پر عبور حاصل کرنا ضروری ہے۔ یہ کام اتنا مشکل ہے کہ کم لوگ اس وادی سے کامیاب گزر سکتے ہیں، پھر ادب کے ساتھ تاریخ، نفسیات اور سائنس کے اصولوں پر نظر درکار ہے اور دوسرے فنونِ لطیفہ سے مَس شرط ہے۔" [تنقید کیا ہے، ۱۳۸]

O

"اُردو ادب میں تنقید اب بیدار اور دُوربین ہو رہی ہے۔ اس نے اپنی اہمیت کو منوالیا ہے۔" [تنقیدی اشارے، ۲۱۶]

O

"تنقید نے ادب میں خارجیت پیدا کی ہے۔ شاعری نے جو جذباتی طوفان اُٹھائے تھے اُن کی قوت کو زندگی کے قافلے کے لیے اسیر کرلیا ہے۔" [تنقیدی اشارے، ۲۱۶]

O

"تعمیری صلاحیتوں کا اُبھرنا، اصولی بحثوں کا سامنے آنا، عام اصطلاحوں کے فریب سے نکلنے کی کوشش کرنا، ہر پُرانی حقیقت کو نئے سرے سے دیکھنا اور پرکھنا تنقید کے اثر سے آیا ہے۔" [تنقیدی اشارے، ۲۱۶]

O

" ہماری تنقیدیں اب تک بیشتر پروپیگنڈہ ہیں۔ ہم یا تو کسی کی تعریف کرتے ہیں یا اُس کے چیتھڑے بکھیرتے ہیں یا اپنی علمیت کا مظاہرہ ادبی اصطلاحوں، ناموں اور نظریوں سے کرنا چاہتے ہیں۔"

[تنقید کیا ہے، ۱۳۷]

○

اُردو ادب پر بعض تاریخی وجوہات کی بنا پر مذہب و اخلاق، فن اور رسم و رواج کا احتساب بہت سخت رہا، اسی لیے ادبی کارناموں پر اچھے تنقیدی مُطالعے کم ہیں، عدالتی فیصلے اور مُفتیانہ فتوے زیادہ۔"

[تنقیدی اشارے، ۲۴۷]

○

"حالی ہمارے پہلے نقاد ہیں۔"

[مسرت سے بصیرت تک، ۱۰۱]

○

" اس میں کوئی کلام نہیں کہ تنقید صحیح معنی میں حالی سے شروع ہوئی، حالی سے پہلے شاعر اُستادوں کو مانتے تھے نقادوں کو نہیں۔"

[تنقید کیا ہے، ۱۹۰]

○

"حالی سے ہماری اُردو تنقید وزن اور وقار حاصل کرتی ہے۔ اس میں حکیمانہ نظر اور سماجی شعور پیدا ہوتا ہے، ادب اور زندگی کے رشتے کا احساس وجود میں آتا ہے۔"

[تنقیدی اشارے، ۲۵۰]

○

"حالی کی تنقید اُن کی تخلیق کے جواز کے طور پر وجود میں آئی۔"

[مسرت سے بصیرت تک، ۱۰۱]

○

" حالی ہمارے پہلے بڑے نقاد ہیں جنہیں تجربات میں فرق کرنا آتا ہے اور قدروں کا

احساس رکھتے ہیں مگر جو تجربات اور قدروں کی وضاحت نہ کر سکے "

[تنقیدی اشارے، ۲۰۴]

O

"حالی نے ادبی تنقید کو چند قابلِ قدر پیمانے دیئے مگر آج اس بات کی ضرورت ہے کہ تنقید میں طرفداری کی لَے کو کم کیا جائے اور سخن فہمی کو بڑھایا جائے۔"

[مسرت سے بصیرت تک، ۱۰۱]

O

"حالی جانتے تھے کہ ہمارے پاس کیا نہیں ہے۔ کیا ہونا چاہیے پر بھی ان کی نظر تھی، مگر کیسے ہو کے لیے وہ ہمیں زیادہ مدد نہیں دے سکے۔"

[تنقیدی اشارے، ۲۰۴]

O

"جدید تنقید حالی کے اثر سے قبل از وقت نظریاتی ہو گئی۔"

[مسرت سے بصیرت تک، ۶۶]

O

"سرسید اور اُن کے رُفقا سے پہلے ہماری تنقید کا معیار شخصی اور صنعتی تھا، شاعر کو اپنے ماحول سے بیگانہ عالمِ بالا میں پرواز کرتے ہوئے دکھایا جاتا تھا اور اُس کے کلام کی اچھائی یا بُرائی اساتذہ کے اسناد سے متعین کی جاتی تھی۔" [تنقیدی اشارے، ۱۱۸]

O

"سرسید اور اُن کے رُفقا نے تنقید کا دوسرا رنگ نکالا جس میں شاعر کے خیالات کا ماخذ اس کے ماحول میں تلاش کیا جاتا ہے اس کی سیرت کو پرکھا جاتا ہے اور کلام سے مطابقت کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس کے خیالات کی بلندی اور گہرائی پر نظر

ڈالی جاتی ہے پھر کہیں اس کا درجہ متعین کیا جاتا ہے۔" [تنقیدی اشارے، ۱۱۸ و بعد]

○

"حالی پر فراق کی تنقید، نظیر پر مجنوں کی رائے، ترقی پسند ادب پر فیض کے مضامین "انادی ادب" از اختر انصاری اور عزیز احمد کی نئی کتاب "ترقی پسند ادب" ہمارے تنقیدی سفر میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔" [تنقیدی اشارے، ۲۱۲]

○

"تبصروں، دیباچوں، مقدموں اور تعارفوں میں عام پر جو تنقید ملتی ہے اس میں تنقید کے علیحدہ رنگ ہیں۔" [تنقید کیا ہے، ۱۹۶]

○

"تبصروں، دیباچوں، مقدموں اور تعارفوں میں سے ہر ایک کا میدان الگ ہے۔" [تنقید کیا ہے، ۱۹۶]

○

"تبصرہ یا ریویو بعض اہم خصوصیات کی طرف اشارہ کرتا ہے۔"
[تنقید کیا ہے، ۱۹۷]

○

"دیباچہ یا تعارف، کتاب یا صاحب کتاب کا تعارف کراتا ہے، اس کی اہمیت کو واضح کرتا ہے، اس کی قدر و قیمت متعین نہیں کرتا، متعین کرنے میں مدد دیتا ہے۔" [تنقید کیا ہے، ۱۹۶]

○

"مقدمہ دیباچہ یا تعارف سے ذرا آگے بڑھ جاتا ہے وہ قدر و قیمت بھی متعین کرتا ہے اور قول و فعل بھی پیش کر دیتا ہے۔" [تنقید کیا ہے، ۱۹۷]

○

"عام طور پر مقدّموں میں بالغ نظری سے زیادہ شرافت کا ثبوت دیا جاتا ہے۔ ان میں سے اکثر یقیناً گمراہ کُن ہوتے ہیں۔" [تنقید کیا ہے، ۱۹۷]

O

"ہمارے فکر و فن میں ابھی تک ریزہ خیالی اور انتشارِ ذہنی بہت ہے۔ ہم افراد کو یا تو فرشتہ سمجھتے ہیں یا شیطان یا قابلِ پرستش یا لائقِ دار — اسی طرح ہمارے نزدیک تحریکیں یا اچھی ہوتی ہیں یا بُری۔ نظر کی کلّیت اور جامعیت ابھی ہمارے یہاں کمیاب ہے۔"

[ادب اور نظریہ، ۵۸]

O

"ادب میں علم اور علمیت کی کمی، اس علم میں تہذیب و تربیت کی کمی (یہاں محض کتابوں کا علم نہیں بلکہ زندگی اور کائنات کا علم مُراد ہے) تنقیدی شعور کی طرف توجّہ نہ کرنے اور ذوق کی صلاحیت و اصلاح سے بے نیاز رہنے کی برکت ہے۔"

[تنقید کیا ہے، ۲۰۰]

O

"ادب میں عالمگیر اُصولوں پُرزور تعمیری صلاحیتوں پر اصرار اور ادب و تنقید میں فن کی بلندی اور گہرائی پر توجہ صحیح ہے۔" [تنقیدی اشارے، ۲۱۳]

O

"تنقید کے جامع اصول دورِ حاضر کا عطیہ ہیں۔" [مسرت سے بصیرت تک، ۱۲۰]

O

"مغرب کے اثر سے اُردو میں کئی خوشگوار اضافے ہوئے، ان میں سب سے اہم فنِ تنقید ہے۔"

[تنقید کیا ہے، ۱۸۹]

O

"ہمیں اُردو تنقید کے معیار کو اور بلند کرنا ہے اور اسے عالمی معیاروں تک لانا ہے اس کے لئے ہر پُرخلوص اور سنجیدہ کوشش اپنا جواز آپ ہے ۔"

[نئے اور پرانے چراغ ، ۱۶]

o

rekhta

(۱۱)

# تنقید کے مسائل

موجودہ[1] تنقید کے متعلق میرا رویہ نہ مدلل مداحی کا ہے نہ مسلسل مرثیہ خوانی کا۔ مَیں موجودہ تنقیدی معیار سے مطمئن نہیں ہوں مگر اسے کم مایہ بھی نہیں سمجھتا خصوصاً آزادی کے بعد جو تنقیدی سرمایہ وجود میں آیا ہے، اُس کی کمزوریوں کا احساس رکھتے ہوئے مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی پس وپیش نہیں کہ اس نے اُردو تنقید کو نئی منزلوں میں قدم رکھنا سکھایا ہے۔ اُردو میں تحقیق نے بھی بڑی ترقی کی ہے اور اس ترقی میں یونیورسٹیوں کے اساتذہ کا بھی ہاتھ ہے گو ابھی یہاں معیار پر کم اور پیداوار پر زیادہ توجہ ہے۔ مگر یونیورسٹیوں کا کام صرف نئی معلومات فراہم کرنا ہی نہیں ہے معلومات کی معنویت کی طرف بھی اشارہ کرنا ہے۔ اس لیے ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم نہ صرف تحقیق میں اور ترقی کریں، ہمارے لیے اس سے زیادہ ضروری یہ ہے کہ ہم ایک اچھے تنقیدی شعور پر اصرار کریں اور اس تنقیدی شعور کی مدد سے تدریس، تحقیق اور تنقید تینوں میں اس علم کو عام کریں جو خوب سے خوب تر کی جستجو کر سکے اور سہل پسندی سستی مقبولیت اور سستی سیاست کے دور میں فکر وفن کی اعلیٰ ترین قدروں کا علمبردار ہو۔

---

[1] نظر اور نظریے، ۱۱۸ــــ۱۳۸

آزادی کے بعد ہندوستان نے ترقی ضرور کی ہے مگر آزادی کے حقیقی مفہوم کو نہ سمجھنے کی وجہ سے ہم نے اسے حقوق کا ایک لامتناہی سلسلہ سمجھا ہے۔ فرائض کی سخت اور صبر آزما سیڑھیاں ہمیں یاد نہیں رہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ حقوق کی جنگ اور اقتدار کی دوڑ میں ہم عقیدے کے بحران، تہذیب کے بحران اور قدروں کے بحران میں گرفتار ہو گئے ہیں۔ یورپ نے جب ازمنۂ وسطیٰ کی منزل سے گزر کر جدید دور میں قدم رکھا تو اس نے روشن خیالی اور عقلیت کو شمعِ راہ بنایا، سائنسی نظر اور اس کی عقلیت اور تجرباتی طریق دونوں سے کام لیا۔ ذہن کو حریتِ فکر سکھائی۔ انسان دوستی اور فرد کے احترام پر زور دیا۔ زندگی کے سیکولر مزاج کو بڑھایا۔ خیال اور اظہار کی آزادی پر اصرار کیا، تشکیک اور اختلاف کا احترام سکھایا، جمہوریت کا تجربہ کیا، ادب کے فروغ کے ذریعے سے قوموں کو اپنی خودی کو پہچاننے اور اس پر اصرار کرنے کی طرف مائل کیا اور افراد کو اپنی ذات کے عرفان اور ذات کے اظہار کے ذریعے سے وہ چنگاری دی جو انھیں آتش بجاں رکھ سکے۔ ان چیزوں کے ساتھ یورپ کی صنعتی زندگی نے مادّی خوشحالی اور سستی تفریح کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دی۔ اس نے کاروبار اور اشتہار کو قدر بنا دیا۔ اس نے مشین سے کام لیتے لیتے کلچر پیدا کرنا شروع کر دیا۔ یورپ کے حکماء اور فلسفیوں کو یورپین تہذیب کے ان امراض کا احساس ہے، مگر ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہم نے یورپ سے حریتِ فکر کا سبق نہیں سیکھا، جمہوریت کے مفہوم کو نہیں سمجھا، سائنسی نظر نہیں پیدا کی۔ انسان دوستی اور سیکولرزم کے رموز حاصل نہیں کیے، فرد کی آزادی، تشکیک اور اختلاف کی اہمیت کو نظر انداز کرتے رہے عقلیت اور تجرباتی طریقۂ کار سے کام نہیں لیا۔ ہاں صنعتی دور کی کاروباری ذہنیت، اشتہاریت اور مادّی خوشحالی کی روایت لے لی۔ ہماری یونیورسٹیوں کا یہ فرض تھا کہ وہ جاہ طلبی کے اس دور میں علم کا پرچم بلند رکھیں مگر یونیورسٹیاں اپنے گرد و پیش کے خلفشار سے بالکل محفوظ کیسے رہ سکتی ہیں۔ ہاں یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ یونیورسٹیاں اپنے بنیادی منصب یعنی قدروں کے فروغ کو بھولتی جاتی ہیں اور حریتِ فکر اور عام روش سے اختلاف

کی اہمیت کو پس پشت ڈالنے لگی ہیں۔ یونیورسٹیوں کا کام ارباب سیاست کی بازی گری کا پردہ چاک کرنا بھی ہے اور ہر ایسے فلسفے، نظریے، مکتب فکر پر تنقیدی نظر ڈالنا بھی ہے جو جامد ہو چکا ہے یا جو فیشن اور فارمولا بن چکا ہے۔ یونیورسٹی کے اُستاد کے لئے وہ علم ضروری ہے جو روایت کا احساس رکھے مگر روایت پرست نہ ہو، جو تجربے سے توانا ہو، مگر تجربے کے معنی اپنی کمی یا محرومی کی پردہ پوشی کے نہ لے۔

ہمیں اپنی یونیورسٹیوں میں اس پر اصرار کرنا چاہیے کہ اُستاد اپنے سارے ادبی سرمایے پر نظر رکھتا ہو اور اس نظر نے اُسے ادب سے ایک شغف دیا ہو۔ معلّمی ایسا ویسا کاروبار نہیں کاروبارِ شوق ہے اس میں دیکھنا بھی ضروری ہے اور دکھانا بھی اور دیدہ وری سے محبت بھی، لیکن کیا دکھانا، صرف قصوّف کے رموز یا مذہب کے احکام یا اخلاق کے مسائل یا حسن و عشق کے راز و نیاز ہی نہیں، خیالات و جذبات کا موزوں الفاظ کا جامہ پہنانا، لفظ کا تخلیقی استعمال اور لفظ کا تعمیری استعمال، لفظ کا صوتی آہنگ، معنی کی تہیں، استعارے کے ذریعے سے خیال کی توسیع اور علامات کے استعمال سے حقایق کی کچھ ایسی تعبیریں جو زندگی کو نیا رنگ و آہنگ دیتی ہیں، حُسن کے نئے جلوے، اور بات کہنے کے نت نئے انداز۔ مگر اس کے لئے ضروری یہ ہے کہ ادب کا معلّم خواہ کوئی نظریہ رکھتا ہو مگر ادب کو نہ مذہب کا محکوم سمجھے نہ اخلاق کا نائب نہ سیاست کا سیاہی نہ صحافت کا سلسلہ بلکہ خواہ وہ ادبی افکار کو اہمیت دیتا ہو یا اخلاقی اقدار کو، سیاسی نظریوں کو یا کسی خاص علمی طریقۂ کار کو مگر ادب کے مطالعے میں ادب کے مخصوص منصب، اس کے جمالیاتی عنصر، اس کی حُسن کاری کو اوّلین درجہ دے اور اس کی مخصوص بصیرت کو کسی دوسری بصیرت کے مقابلے میں کم مایہ

نہ سمجھے۔

اس سلسلے میں ٹائمس لٹریری سپلیمنٹ ۲۷ جولائی ۱۹۶۷ء کا یہ اقتباس دلچسپی سے خالی نہ ہو گا:

"آئی۔ پی۔ بلیک مور نے ایک دفعہ کہا تھا کہ ادب دستیاب حقیقت کے سرمایے میں اضافے کی ایک کوشش ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ مُصنّفوں کو زیادہ اطلاعات یا معلومات دینا چاہئیں، نہ اس کا یہ مطلب تھا کہ ادب دوسرے شعبوں کے ماہرین کی تائید کے لیے حاضر رہے۔ اس کا سیدھا سادا مطلب یہ تھا کہ مادی حقایق اور خیالات تجربے کے سرچشمے سے آسانی سے اور مہلک طریقے سے علیحدہ ہو سکتے ہیں اور مُصنّف کا کام یہ ہے کہ وہ ان دونوں کو پھر سے ایک دوسرے سے مربُوط کرے اور فن میں ان کے انسانی اور تخلیقی نتائج کو پرکھے۔ اس طرح ادب خیالات کو حقیقی بنا سکتا ہے۔ یعنی اس مواد (احساسات) تک ایک ٹھوس شکل میں پہنچا جا سکتا ہے اور ادب کے لئے اگر کوئی FUNCTION یا مقصد متعین کیا جا سکتا ہے تو ہم اس سے زیادہ نہیں جا سکتے۔"

یہ بات میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ میرے نزدیک ہماری تنقید نے ابھی تک کُھلے بندوں دل سے اور صاف لفظوں میں اس حقیقت کا اعتراف نہیں کیا ہے۔ ادب میر کا وہ باغ ہے جسے کسی امیر دوست کے پائیں باغ کے دریچے کی ہر وقت ضرورت نہیں کیونکہ اس کے اپنے باغ میں پہلے سے زندگی کے کتنے باغ و صحرا حل ہوئے ہیں۔ اس کے معنی یہ بھی نہیں کہ ادب صرف جگر کادی اور سینہ خراشی کا فن ہے، لیکن اس کے یہ معنی ضرور ہیں کہ ادبی نظریات میں ذاتی تجربے کو بنیادی اہمیت

حاصل ہے۔ ایک نقاد نے تو شاعری اور ادب کو زندگی کی ایک شخصی اور ذاتی تعریف کہا ہے۔ یہ تجربہ داخلی اور جذباتی ہوتا ہے۔ تجربے کی قدر و قیمت، اُس کی گہرائی، اُس کی معنویت، اُس کی اپنی صداقت، اس کی پیچیدگی اور اُس کی علامتی نوعیت میں ہے نہ کہ کسی اخلاقی، سیاسی، فلسفیانہ یا سائنسی نظریے سے مطابقت میں۔ ہاں اس تجربے میں چونکہ سیاست اور فلسفہ اور اخلاق کی قدریں بھی در آتی ہیں اس لئے اپنی اپیل میں وہ اکثر فلسفہ و اخلاق سے کمتر ثابت نہیں ہوتیں اسی لیے ادب ان معنی میں سماجی دستاویز یا اخلاق کا صحیفہ نہیں ہے جن معنوں میں سوشیالوجی کی کوئی کتاب یا اخلاقیات کا کوئی نظام کیونکہ ادب کی عظمت سماجی یا اخلاقی نظریوں سے مطابقت میں نہیں اس کے سماج اور اخلاق کا اپنے طور پر احساس دلانے میں ہے۔ فن کو اخلاقی نظریے کی اس لیے ضرورت نہیں کہ فن خود اخلاق ہے اسے اسی طرح سیاسی نظریے کی بھی ضرورت نہیں کہ وہ بھی اپنے طور پر سیاسی شعور دیتا ہے۔ ادبی تنقید کو ادب کے اسی منصب کا احساس عام کرنا ہے کیونکہ اب بھی ادب سے تلوار یا نعرے کا کام لیا جاتا ہے۔ ہمارے کلاسیکل ادب میں ادب کے فنی اور صناعانہ پہلو پر زیادہ زور تھا۔ سرسید اور حالی نے اس کے اصلاحی اور اخلاقی رول پر زیادہ زور دیا۔ ادبِ لطیف والوں نے اسے فن برائے فن کے سطحی تصور کے لئے استعمال کیا۔ ترقی پسند تنقید نے اس سے ایک سیاسی نظریے کی ترویج میں کام لیا اس میں زندگی سے مراد ایک خاص زندگی اور حقیقت سے مراد ایک خاص طبقاتی کش مکش کی مصوری تھی اور سماج سے مراد ایک خاص سماجی نظریہ۔ یہ نظریے یکسر غلط نہیں ہیں ہاں یہ یک طرفہ ہیں اور ان سے ادب کے حقیقی رول کا پورا پورا اظہار نہیں ہوتا اسی لئے میں ادب کے جمالیاتی پہلو کو سب سے زیادہ اہمیت دیتا ہوں اور میرے نزدیک اس جمالیات میں سماجی اور اخلاقی قدروں کی پوری پوری گنجائش موجود ہے۔

ہماری تنقید نے جب عقلیت کے زیرِ اثر نیچر سے مطابقت کو مطمحِ نظر بنایا تو اس نے فطرت کے جمال ہی کو مدِ نظر رکھا اس کے جلال کو نظر انداز کر دیا۔ اسی طرح اس نے سماجی انسان پر زیادہ زور دیا اور اس آدمی کو نظر انداز کر دیا جو اپنے پیچھے ایک لمبی تاریخ جانور کی رکھتا ہے، ادبِ لطیف کے دور میں صرف رومانی جذبات سامنے آئے، ترقی پسند تحریک نے اس سماجی انسان کی جستجو کو اور آگے بڑھایا۔ یہ اکہری آوازوں کا ادب تھا اس لئے ان کی تنقید بھی اکہری تھی۔ بیسویں صدی میں ہیں مشرق و مغرب میں اس آدمی کی آواز سنی ہے جسے ایمان روکتا ہے اور کفر کھینچتا ہے جسے حسن سے بھی لگاؤ ہے اور جسے زندگی بھی عزیز ہے جو خواب بھی دیکھتا ہے اور ان خوابوں کی لاحاصلی کو بھی جانتا ہے جسے ایلیٹ کے الفاظ میں شاعری کی تینوں آوازوں سے کام لینا پڑتا ہے جو حسن کے پرانے یونانی اور لاطینی سانچوں سے اُکتا کر کبھی کبھار پکاسو کی طرح بدصورتی میں حسن پاتا ہے کیونکہ بقول کاکتو کے پکاسو اس لئے بدصورت معلوم ہوتا ہے کہ وہ حسن سے آگے بھی دیکھتا ہے جو شیرینی کے بجائے کچھ تلخی کا مطالبہ کرتا ہے اور بنی اسرائیل کی طرح من وسلویٰ سے گھبرا کر کھیرے اور ککڑی، لہسن اور پیاز کا چٹخارا تلاش کرتا ہے جسے لب و لہجے میں ایک جہانِ معنی نظر آتا ہے، جو بھری بستی میں اپنے کو تنہا محسوس کرتا ہے کیونکہ کوئی اسے پہچانتا نہیں اور نہ اس کا درد جانتا ہے یعنی تنقید اگر صرف اکہری آوازوں یا اکہری شخصیتوں کی درجہ بندی میں لگی رہی تو وہ اپنی معنویت کو محدود کر دے گی لیکن اگر اس نے حسیت SENSIBILITY کی تبدیلی کے ساتھ اظہار EXPRESSION میں تبدیلی کے راز کو پالیا تو وہ ادب کی سچی بصیرت عام کر سکے گی۔ اس کے معنی کلاسیکی تنقید سے انکار نہیں نہ کسی تنقید کے دبستان کو یکسر غلط سمجھنے کے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ بدلتے ہوئے ذہن کے ساتھ بدلتی ہوئی زبان اور اس کے بدلتے ہوئے آہنگ

کی پرکھ کا تنقید کو احساس ہو۔ اس لئے صرف سیاہ و سفید والی ساری تنقید ہمارے لئے گمراہ کن ہے بلکہ ہمیں ایک ایسے نظریے کی ضرورت ہے جو تمام رنگوں کا عرفان دے سکے۔ اسی لئے میرا مطالبہ یہ ہے کہ ہم ادب کے سچے وفادار ہوں۔ ادب سے وفاداری ہی زندگی سے ہماری وفاداری کا دوسرا نام ہو گا اب تک جو وفاداری COMMITMENT کا ادب ہے اس کی وفاداری زندگی کے ایک خاص تصور سے ہے لیکن دنیا کے بڑے شاعر اور ادیب زندگی کے کسی خاص نظریے سے وفاداری کی وجہ سے بڑے نہیں ہوئے ان کی بڑائی اپنی ادبی نظر سے وفاداری میں ہے۔ شیکسپیئر یا غالب کو کسی نظریۂ زندگی میں مقید نہیں کیا جا سکتا۔ کسی خاص نظریے کی وجہ سے ادب نہ اچھا ہوتا ہے نہ برا۔ بڑائی اپنے مسلک سے پوری وفاداری میں ہے خواہ کوئی بھی مسلک ہو "وفاداری بشرطِ استواری اصلِ ایماں ہے"۔ پُرامن وجود باہمی PEACEFUL CO-EXISTENCE۔ سیاست کی چال ہو مگر ادب میں ذہنی صحت کی علامت ہے ادب کے باغ میں سو طرح کے پھولوں کی گنجائش ہے۔

اسی بنیادی چیز پر زور دینے کے بعد مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجیے کہ ہمیں بی۔اے اور ایم۔اے کی منزل پر ادب کی تعلیم میں اپنی توجہ فن کار سے ہٹا کر فن پر مرکوز کرنی پڑے گی۔ ظاہر ہے کہ فن کار کی زندگی کے حالات، اس کی شخصیت اس کے ماحول کا مطالعہ مفید سہی مگر تنقید کا بنیادی مقصد نہیں ہے۔ یہ اس لیے مفید ہوتا ہے کہ اس سے فن کو سمجھنے میں کچھ مدد ملتی ہے، مگر اصل چیز فن ہے اور فن لفظ کے خیال انگیز ہونے میں ہے۔ میں یہ بات اس لئے کہہ رہا ہوں کہ ایم۔اے کے بہت سے طلبا اقبال کے فن کے متعلق بہت کم جانتے ہیں ہاں وہ اقبال کے اسلامی افکار، ان کے مسلمانوں کی زندگی میں انقلاب لانے اور مغربی فلسفیوں سے اثر قبول کرنے کے متعلق خاصی معلومات رکھتے ہیں وہ درد یا آتش کے فن کو نہیں دیکھتے ان کے تصوف کے اسرار کی پردہ کشائی

میں لگے رہتے ہیں۔ غالب کے اکثر اشعار پر تنقید میں غالب کے تصوف یا اُن کی قنوطیت یا رجائیت کے متعلق زیادہ تر اظہارِ خیال ہوتا ہے مگر یہ بات کم ملتی ہے کہ اندیشہ ہائے دور دراز یا آشوب آگہی یا قانونِ باغبانیِ صحرا جیسی تراکیب سے کیا تصویریں سامنے آتی ہیں ان کے ساتھ کیسی تصویریں لپٹی ہوئی ہیں اور یہ کس طرح تہہ در تہہ معنی رکھتی ہیں اور اس طرح اپنی خیال انگیز زبان سے کس طرح ہمارے تخیل کو تقویت دیتی ہیں اور کس طرح ہمیں زیادہ حساس اور دور بین بناتی ہیں۔

فن کے اس نئے تصور میں ہمیں وزن کے پُرانے اور نئے سانچوں کو بھی ملحوظ رکھنا پڑے گا اس کے معنی یہ ہیں کہ ہمیں شاعری کے متعلق بات کرنے کا حق ہی نہیں ہے جب تک ہم عروض سے واقف نہ ہوں اور عروض سے واقف ہو کر ہی ہم عروض کی سخت گیری اور آزاد نظم کی کھلی فضا اور شعرِ منثور کے آہنگ کو سمجھ سکتے ہیں اس معاملے میں ہماری پرانی تنقید محدود سہی مگر ہم سے زیادہ وزن رکھتی تھی کہ وہ وزن کے سانچوں اور قافیے کے آداب سے واقف تھی۔ اس کی خرابی یہ تھی کہ وہ ہماری کلاسیکل موسیقی کی طرح صرف قواعد پر اصرار کرتی تھی ان کی روح کو سمجھنے کی بالکل کوشش نہیں کرتی تھی اسی لئے میں بیسویں صدی کی ابتداء میں عظمت اللہ خاں کے مضامین اور حال میں گیان چند کے مضامین کی اہمیت کی طرف آپ کو توجہ دلانا چاہتا ہوں اگر ہم اپنے عروضی نظام اور سالم بحروں اور زحافات کے قواعد کو سمجھ لیں اور اس بات کو بھی دھیان میں رکھیں کہ ہمارے صوتی آہنگ میں اور ایرانیوں اور عربوں کے صوتی آہنگ میں فرق ہے تو اوّل تو پنگل کی طرف عظمت اللہ خاں کی توجہ کا راز سمجھ میں آجائے گا اور دوسرے اس کمی کا احساس ہو جائے گا جو گیت کے سارے سرمایے کو ہندی کے حوالے کر کے اپنی میراث سے بے اعتنائی کی وجہ سے پیدا ہوئی۔ اس سلسلے سے یہ بات بھی واضح ہو جائے گی کہ آزادی کے بعد کیوں گیتوں کی طرف توجہ زیادہ ہوئی

یہ کوئی من کی موج نہیں بلکہ آج کے شاعر کی اپنی چیزوں کی تلاش اور اپنی ساری ادبی تاریخ اور پوری ادبی روایت سے کام لینے کی شعوری رد کا نتیجہ ہے۔ پھر قافیے کو جو اہمیت ہماری شاعری میں حاصل تھی اس کو ہم صرف یہ کہہ کر نہ ٹالیں گے کہ بھائی شاعری معنی آفرینی ہے قافیہ پیمائی نہیں ہے بلکہ شاعری ہی میں نہیں نثر میں بھی قافیے کے استعمال سے ترصیع اور تکرار کا جو نظام وجود میں آتا ہے اس کی ضرورت سمجھ میں آجائے گی اور یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ ہماری پرانی شاعری میں خرابی یہ نہیں تھی کہ اس میں قافیے اور ردیف پر اصرار تھا بلکہ خرابی یہ تھی کہ اس کا ایک ہی طرح استعمال تھا۔ اگر ہم اس بات پر غور کریں کہ سترھویں اٹھارھویں صدی میں انگریزی شاعری نے جس HEROIC COUPLET کو شستہ و رفتہ بنایا اسی کو اس صدی کے ختم ہوتے ہی رومانی شعرا نے اپنے خیال کی پرواز کے لیے زنجیر سمجھا تو یہ بھی واضح ہو جائے گا کہ قافیہ، گو شاعری میں بنیادی اہمیت نہیں رکھتا مگر اس سے شاعری اور نثر دونوں میں اب بھی بڑا کام لیا جا سکتا ہے اور لیا جاتا رہے گا چنانچہ فیض کی نظم 'اک ذرا سوچنے دو' میں قافیے خصوصاً اندرونی قافیے کے موقع و محل کے مطابق استعمال کو مرکزی اہمیت حاصل ہے۔

فن کے اس تصور کا ایک تقاضا اور بھی ہے۔ ہماری تنقید میں تشبیہ اور استعارہ بھی صنایع و بدایع کے ذیل میں آتا تھا گو یہ ضرور تھا کہ اس کو دوسرے صنایع کے مقابلے میں زیادہ اہمیت دی جاتی تھی۔ تشبیہ و استعارہ محض آرائشی یا وضاحتی آلے نہیں ہیں۔ ان کی شاعری میں بنیادی اہمیت ہے۔ استعارے کی اس اہمیت کو حال میں پہچانا گیا ہے اور استعارے اور علامت کا فن میں جو برگزیدہ مقام ہے اس کی طرف خاص توجہ ہوئی ہے۔ میں اس بات کو ایک مثال سے واضح کرنا چاہتا ہوں استعارے انیس بھی استعمال کرتے ہیں اور دبیر بھی۔ انیس کے یہاں استعارہ ایک جہانِ معنی ہے

اور وہ نہ صرف شاعر کے تخیل کی بلندی اور اس کی رنگا رنگی کو ظاہر کرتا ہے بلکہ ہمارے ذہن میں چراغاں کر دیتا ہے۔ دبیر کا استعارہ ہمیں مبہوت و متحیر تو کر دیتا ہے مگر ذہن میں روشنی نہیں کرتا۔ اسی طرح غالب و ذوق کے استعاروں پر غور کیا جائے تو ذوق سوئے ہوئے استعاروں یعنی محاوروں سے کام لیتے ہیں جن کی فوری اپیل ہے مگر جو ذہن کو اکساتے نہیں نہ تخیل کو وسعت بخشتے ہیں۔ استعارے کے ذریعے جس طرح شاعر زبان کی پرواز، طاقت اور جادو جگانے کی صلاحیت کو بڑھاتا ہے اور گویا زبان کو زیادہ خیال انگیز اور زرخیز بناتا ہے اس کی طرف ہماری تنقید کو اور توجہ کرنا ہے۔ غالب و اقبال کے استعاروں پر 'سانحہ' نظر سے پوری توجہ ہو تو ان کی عظمت کے کچھ اور پہلو بھی سامنے آئیں گے۔

فن کے عرفان کا ایک پہلو اور بھی ہے جس کی طرف یہاں اشارہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے اور وہ غزل کی تنقید کے سلسلے میں ہے جس پر ہمیں نظر ثانی کرنی چاہیے۔ حالی کے وقت سے غزل کی اصلاح کا غلغلہ شروع ہوا اور عظمت اللہ نے اس کی گردن بے تکلف مار دینے کا مشورہ دیا۔ کلیم الدین نے اسے جن معنی میں نیم وحشیانہ صنف کہا تھا ان معنوں پر لوگوں کی نظر نہیں گئی گو میں عظمت اور کلیم کے خیالات کو انتہا پسندی پر مبنی سمجھتا ہوں مگر میرے نزدیک غزل کے نام پر ہم جس بھان متی کے پٹارے کو سینے سے لگائے ہوئے تھے اس کے طلسم کو توڑنا ضروری تھا ایک تو اس لئے کہ غزل میں روایتی مضامین کی لے بڑھتی جا رہی تھی، دوسرے اس کا FORMLESS FORM ہمارے شعرا کو مجموعی تاثر اور پیکر کے حسن کی طرف سے کچھ بے پروا بنا رہا تھا اور ان کی اس تعمیری صلاحیت کو نقصان پہنچا رہا تھا جو نظم کے لئے ضروری ہے اس لئے میں جدید غزل کے اس کارنامے کو اہمیت دیتا ہوں کہ اس نے اس وحدتِ تاثر پر زیادہ توجہ دی ہے اور غزل کی رمزیت سے نئے نئے کام لئے ہیں اسی لئے آج کی تنقید جب غزل

کی ڈھلی منجھی اور مہذب اور شائستہ اور اس لئے کچھ بے روح زبان کے بجائے نظم کے لیے اس کے موضوع کے مطابق کبھی پہاڑے کو پھاوڑا کہنے کی زبان کبھی سرگوشی کی زبان، کبھی خطیبانہ لہجے کے بجائے بے تکلف بات چیت کی زبان کو ترجیح دینی ہے تو اس میں ہمیں پرانی چاشنی تلاش نہیں کرنی چاہیے بلکہ جس طرح حالی کی اُبالی کھچڑی اور بے نمک سالن میں ہم نے غذائیت دیکھ لی تھی اس طرح آج کی شاعری کی زبان میں کافی کی ہلکی تلخی یا مولانا آزاد کی گوری چنبیلی کی لطیف کیفیت کو بھی محسوس کرنا چاہیے۔ یہاں مراد یہ نہیں کہ یہ جدید زبان قدیم زبان سے بہتر ہے، یہاں صرف یہ دیکھنا ہے کہ یہ زبان محض بہلانے یا جذبات کے طوفان میں بہا دینے یا لفظوں کی چمک دمک دکھانے یا عملی زندگی کی آب و تاب سے لبھانے کے لئے نہیں بلکہ کبھی خیال کے توس پر مکھن کی طرح معنی پھیلانے اور کبھی کچھ دور جا کر خاموشی سے اچانک معنی کے پھٹ پڑنے کے لئے استعمال ہوتی ہے یا کبھی خیال کی رَو اور اس کے آزاد تلازمے کی تصویر کشی کر کے ہمیں شاعر کی ذہنی دُنیا میں سفر کرنے کے قابل بناتی ہے۔ میرا مطلب ہے کہ اچھے نقّاد کو صرف مانوس اسالیب کا ہی شناس نہیں ہونا چاہیے اسے بدلے ہوئے احساس کے نئے نئے رنگ روپ بھی دیکھنے اور دکھانے چاہئیں۔

ہماری تنقید کی ساری اصطلاحیں نظرِ ثانی کی محتاج ہیں۔ ہم نے انگریزی اصطلاحوں کے جو ترجمے کیے ہیں ان میں سے کچھ کار آمد ہیں اور کچھ ناقص۔ پھر اس معاملے میں ہمارے یہاں ایک نراجیت ہے۔ کوئی ایک اصطلاح استعمال کرتا ہے کوئی دوسری۔ اس لئے ہمیں ان تمام ادبی اصطلاحات کی ایک ڈکشنری جلد سے جلد تیار کرنا چاہیے جو ادبی تنقید میں عموماً استعمال ہوتی ہیں اور چونکہ اب ہم تنقید میں نفسیات، فنونِ لطیفہ، فلسفہ، سائنس، سب سے اصطلاحیں لے رہے ہیں اس لیے ایسی ڈکشنری کی تیاری میں ادبی نقّادوں اور دوسرے علوم کے ماہرین کو مل کر کام کرنا چاہیے۔

rekhta

اس کے ساتھ ہمیں اپنی پرانی اصطلاحوں داخلیت، نازک خیالی، خارجیت، تغزل معنی آفرینی، معنی بندی، خیال بندی، رمز، علامت، اشاریت، تمثیل، رنگینی، سادگی، سب کا مفہوم اور قطعی بتانا چاہیے۔

ہمارے نقادوں کو ابھی تک نہ تو ادب اور دوسرے فنونِ لطیفہ کے گہرے تعلق کا پورا علم ہے نہ جدید نفسیات اور جدید فلسفے کا۔ نقاد ماہر نفسیات یا ماہر مورخ یا سائنس داں تو نہیں ہو سکتا لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ علوم و فنون اور افکار و اقدار کا شعور بھی رکھے کیونکہ ادبی تنقید میں ان سب کی ضرورت ہوتی ہے۔ مجھے اپنے دوست احتشام حسین کے خیال سے اتفاق ہے کہ ہمیں سنسکرت تنقید کا علم ہونا چاہیے کیونکہ اس کے بغیر ہم اپنی روایت کی جڑوں کو نہیں پہچان سکتے۔ مگر میں یہ ضرور چاہتا ہوں کہ اس علم کو ہم پیرہنِ سمہ پا نہ بننے دیں۔ میں اپنی روایت سے پوری واقفیت ضروری سمجھتا ہوں مگر میں روایت کو آج کی ضروریات کے لیے استعمال کرنا چاہتا ہوں اور اپنے دوستوں کو یہ بات یاد دلانا چاہتا ہوں کہ ایلیٹ کی تنقید کی خصوصیت ایک صاحبِ نظر نے روایت سے کام لینا THE USE OF TRADITION بتائی ہے۔ روایت کی پابندی کرنے اور روایت سے حسبِ ضرورت کام لینے میں بڑا فرق ہے۔ روایت سے حسبِ ضرورت کام لینا مفید ہے۔ روایت کو برتتے رہنا فرسودگی اور کہنگی کی علامت ہے۔

ایک بات مجھے مشرقی مزاج اور عالمی معیاروں کے بارے میں کہنی ہے۔ اگر مشرقی مزاج کے معنی یہ ہیں کہ ہمیں ہندوستان یا ایشیا سے نظریں ہٹانی نہیں چاہئیں تو میں ایسی مشرقیت کو ذہنی ترقی کے لئے بہت بڑا خطرہ سمجھتا ہوں اور اس کی خاطر جدید دور کو چھوڑ کر ازمنہ وسطیٰ کا ذہن اختیار کرنے کو تیار نہیں ہوں لیکن اگر اس کے معنی یہ ہیں کہ انسانی تہذیب کی وحدت کو مانتے ہوئے اور ساری دنیا کو مرد مومن کی

میراث سمجھتے ہوئے ہمیں اپنی قومی تاریخ اور قومی مزاج کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے بلکہ یہ نکتہ سمجھ لینا چاہیے کہ دنیا میں ارتقا تو ایک خاص سمت میں ہوتا ہے، مگر اس ارتقا کی رفتار مختلف ملکوں میں جغرافیائی اور تاریخی وجوہات کی بنا پر آگے پیچھے ہوتی ہے اور عالمی افکار و اقدار کسی حکیم کا نسخہ نہیں ہیں کہ ہوا شافی کہہ کر پی جائیں بلکہ یہ صرف سمتوں اور منزلوں کی نشان دہی کرتے ہیں جن کی طرف انسانیت کا قافلہ کچھ آگے اور کچھ پیچھے چلتا رہتا ہے تو یہ مشرقیت نہ صرف مجھے قبول ہے بلکہ عزیز بھی بھی ہے۔ بات یہ ہے کہ یہ دور اپنی ساری لعنتوں، ساری آفتوں، ساری زحمتوں اور ساری مصیبتوں کے باوجود مجھے عزیز ہے۔ میں اسے کسی قرونِ اولیٰ یا سنہرے دور میں بدلنے کے لئے تیار نہیں ہوں پھر میں اپنے وطن پر فخر کرتا ہوں مگر چاہتا ہوں کہ عالمی بنوں اور اس لئے جہاں روشنی ہے جہاں حسن ہے جہاں گرمی ہے جہاں جستجو ہے جہاں حقائق کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے کا ولولہ ہے اس میں شریک ہونا چاہتا ہوں ــــ

مجھے اس کا احساس ہے کہ ہماری تنقید بیشتر شاعری کی تنقید رہی ہے اور اس نے نثر پر وہ توجہ نہیں کی جس کی ضرورت ہے مگر اس کی وجہ سے میں کسی کو یہ مشورہ نہ دوں گا کہ وہ شاعری پر تنقید چھوڑ کر نثر پر تنقید شروع کر دے ــ ہاں میرے نزدیک آج ہر باشعور آدمی کو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ نثری اصناف پر تنقید پر آج اور توجہ کرنی ہے۔ متمدن انسان کی عمومی اور سماجی زندگی کے بیشتر پہلوؤں کا اظہار نثر میں ہوتا ہے اور یہ لے اور بڑھے گی اور اس لیے ضرورت ہے کہ ناول، افسانہ، ڈراما، انشائیہ، مکاتیب، خود نوشت اور سوانح عمری کے آداب کو سمجھا جائے اور خصوصاً نثر کی بنیادی خصوصیت پر ہر حال میں زور دیا جائے تاکہ ہم افسانے کی تنقید میں زبان و کردار کی خصوصیات پر زور دینے کے بجائے افسانویت دیکھیں اور دکھائیں اور

ڈرامے میں انارکلی کی زبان کو خوبی کے بجائے خامی سمجھنے پر راضی ہو جائیں۔

اس کے ساتھ میرے نزدیک شاعری اور نثر کی الگ الگ تاریخ اور ادوار کا مطالعہ مناسب نہیں ہے۔ ہمیں کسی دور کے ادب کا مطالعہ کرتے وقت نثر اور نظم دونوں کو ذہن میں رکھنا چاہیے کیونکہ دونوں میں اس دور کی خصوصیات اپنے طور پر جلوہ گر ہوتی ہیں۔ پھر دکن، دہلی، لکھنؤ، عظیم آباد، رام پور اسکولوں کا تذکرہ میرے خیال میں اب ہمارے لئے اتنا مفید نہیں رہا جتنا پہلے تھا۔ اسکولوں یا دبستانوں کی تقسیم در اصل فکر اور اس فکر کی بنیاد پر فن کی خصوصیات کے مطابق ہوتی ہے نہ زبان میں چند جزوی تبدیلیاں یا چند پہلوؤں پر زیادہ زور کسی دوسرے اسکول کو جنم نہیں دیتا۔ دہلی اور لکھنؤ کے اسکول میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے۔ اسی طرح عظیم آباد اور رام پور اسکول کو الگ شمار کرنا میرے نزدیک درست نہ ہوگا۔ ہمیں ادبی مرکزوں کو تو ذہن میں رکھنا چاہیے لیکن مختلف علاقوں میں مقامی خصوصیات کی گنجائش رکھتے ہوئے اُردو کے مجموعی اور عمومی مزاج اور کردار کو کسی وقت فراموش نہ کرنا چاہیے۔

ادبی تاریخوں کے رندے اور چند مشہور نقادوں کے فتوؤں کی وجہ سے ہمارے یہاں ایک اہرامی تنقید PYRAMIDAL CRITICISM رائج ہوگئی ہے۔ میر، غالب، اقبال، نظیر، انیس، یہ اُردو کے پانچ چوٹی کے شاعر مان لئے گئے ہیں۔ اب سودا کی عظمت کا بھی اعتراف ہونے لگا ہے۔ اسی طرح ہم پچھلے نقادوں کا آموختہ دہراتے ہیں۔ قدرِ اوّل ہم خود متعین نہیں کر سکتے۔ راس مسعود مرحوم کو انیس، غالب اور اقبال بہت پسند تھے، یہ بات سبھی کو معلوم تھی۔ انھوں نے ایک مجلس میں کسی نووارد سے سوال کیا کہ اُردو کے چوٹی کے شاعر کون کون سے ہیں۔ اُس نے فوراً جواب دیا غالب انیس اور اقبال۔ راس مسعود بڑے ذہین تھے مسکرا کر کہنے لگے: A VERY SAFE JUDGEMENT —— !!

میں آج کل اس چھاؤں میں چلنے کی روش کو اپنی یونیورسٹیوں میں بہت عام پاتا ہوں۔ میرے نزدیک اس معاملے میں اب ذرا دھوپ کی سختی برداشت کرنے کی ضرورت ہے۔ یعنی یہ نہ ہو کہ خواہ مخواہ میر کی عظمت کو گھٹایا جائے بلکہ میر کی عظمت کا راز دریافت کیا جائے تو پھر اس عظمت کے سائے جابجا یقین اور بیان اور مصحفی کے یہاں بھی مل جائیں گے۔ تنقیدی شعور AFFIRMATION اثبات اور DISSENT اختلاف دونوں پہلو رکھتا ہے۔ جب بے سوچے سمجھے ایمان لانے کی لَے بڑھ جائے تو تشکیک کی ضرورت ہوتی ہے۔ جب تشکیک مزاج بننے لگے تو کچھ قدروں کی شہادت دینے کی ضرورت ہوتی ہے۔ غالب صدی سے ہمیں یہ فائدہ ہو کہ غالب کی عظمت کے نئے نئے پہلو سامنے آئیں۔ اور اردو کے اس عظیم شاعر کی فن کی جنت کا حسن کچھ اور آشکارا ہو۔ ہمیں غالب کے مطالعے کے سلسلے میں ان کے معاصرین پر بھی توجہ کرنے کی ضرورت ہے تاکہ وہ اندازِ بیان اور روشن ہو سکے جو غالب کو معاصرین سے ممتاز کرتا ہے۔ پھر ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ جس طرح ہومر کبھی کبھار اونگھ جاتا ہے اسی طرح غالب بھی بعض اوقات خراٹے لینے لگتے ہیں اور اقبال کے یہاں بھی شاعر اور واعظ کی کشمکش میں واعظ جیت جاتا ہے، گو اقبال کی عظمت ان کی شاعری میں ہے اُن کے وعظ میں نہیں۔ ایک صاحب کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ اخبار نہیں دیکھتے تھے ہاں سال بھر کے بعد اخباروں کے فائل کا مطالعہ کرتے تھے وہ حال سے کوئی دلچسپی نہ رکھتے تھے جب تک کہ وہ ماضی نہ بن جائے۔ انھیں زندگی نہیں تاریخ عزیز تھی۔ کچھ لوگ ایسے بھی ملیں گے جو ہر واقعے پر افسانہ یا نظم لکھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اس طرح وہ زندگی کے مطالبات کا ساتھ دے رہے ہیں۔ واقعاتی ادب اور ہنگامی ادب، ادب نہیں صحافت ہے گو صحافتی ادب بھی ایک چیز ہے۔ ادب میں روحِ عصر ضروری ہے عصریت ضروری نہیں، پھر ماضی کے بعض ادیب ہمارے

ہم عصر ہیں۔ ہمارے بعض اُستاد اپنے شاگردوں پر اپنا فقط نظر لادنے کی کوشش کرتے ہیں یہ غلط ہے۔ اُستاد کا کام شاگرد کے ادبی اور تنقیدی شعور کو بیدار کرنا ہے اسے اُنگلی پکڑ کر چلانا نہیں۔ اسے حلقۂ ارباب ذوق پیدا کرنا ہے' اپنے مریدوں کا حلقہ نہیں۔ افلاطون کے شاگرد ارسطو نے افلاطون سے بہت کچھ سیکھا مگر اس کے باوجود افلاطون سے الگ اپنی راہ نکالی۔ بڑا نقاد وہ نہیں ہوتا جس کی رائے ہمیشہ صحیح مانی جائے۔ بڑا نقاد وہ ہوتا ہے جس کی رائے سے دوسروں کو کسی موضوع پر بہتر اور جامع رائے قائم کرنے کی توفیق ہو اس جامع رائے کا سراغ اس نقاد کی رائے سے ملا ہو۔ یونانی تنقید میں شاعری تخلیق MAKING ہے' یہ دیکھنا SEEING بھی ہے اور کہنا SAYING بھی، ہمارے نقادوں نے اب تک شاعر کے اس دیکھنے اور کہنے کے پہلو یعنی تلقین پر زیادہ زور دیا ہے اچھا ہے اگر اب اس کے ایجاد کرنے MAKING یا تخلیق پر بھی مناسب توجہ ہو اس لئے ہماری درس گاہوں میں کسی فن پارے کا تجزیہ پہلے ہونا چاہیے اور فن کار کے خیالات اور نقادوں کی رائے کا تذکرہ بعد میں۔

ہمیں ہم عصر ادب کے مطالعے پر زیادہ توجہ کرنا چاہیے بلکہ اس کے ذریعے سے قدیم ادب کے مطالعے اور دونوں کی مدد سے ذوقِ سلیم کی ترویج کرنا چاہیے۔ ہم عصر ادب کی یعنی اپنی نسل کی بہت سی باتیں بڑی اُلجھن میں ڈالنے والی، بڑی پریشان کرنے والی، بڑی عجیب بڑی بے تکی معلوم ہوتی ہیں مگر ان کی بے راہ روی میں اکثر ایک نئی سمت کی تلاش بھی مل جائے گی جسے ہم کچھ لوگوں کی کجروی یا گمراہی سے الگ کر سکتے ہیں۔ برٹرینڈ رسل نے اپنی خودنشت میں کہا ہے:

"ہم دیکھتے ہیں کہ ہماری نسل مقابلتہً کچھ دیوانی ہے کیونکہ اس نے سچ کی جھلکیاں دیکھنے کی جرأت کی ہے اور سچ SPECTRAL دیوانہ

خوفناک ہوتا ہے۔ لوگ جتنا ہی اس کا مشاہدہ کرتے ہیں اتنا ہی ان کی ذہنی صحت کم محفوظ رہ پاتی ہے۔ وکٹورین عہد کے لوگ ہوش مند اور کامیاب اس لئے تھے کہ وہ سچ کے قریب کبھی نہیں آئے ۔ مگر جہاں تک میرا تعلق ہے، میں دیوانہ ہونا پسند کروں گا، بہ نسبت اس کے کہ جھوٹ کے ساتھ فرزانہ کہلاؤں ۔"

مجھے اعتراف ہے کہ میں اس معاملے میں رسل کے ساتھ ہوں :

نازم بہ کفرِ خود کہ بایماں برابر است !

rekhta

(۱۲)

# اُردو میں ادبی تنقید کی صورتِ حال

Hasnain Sialvi

ادبی تنقید[1] نے پچھلے تیس سال میں بڑی ترقی کی ہے اور آج اس کا سرمایہ خاصا اہم ہے، مگر مجموعی طور پر اب بھی اس میں طرفداری زیادہ ہے سخن فہمی کم۔ طرفداری یا جانبداری کو میں بُرا نہیں سمجھتا لیکن طرفداری اور سخن فہمی کے فرق پر زور دینا چاہتا ہوں تنقید میرے نزدیک وکالت نہیں پرکھ ہے۔ کبھی کبھی جب کوئی روایت فرسودہ ہو جاتی ہے تو بغاوت کے لئے وکالت کی ضرورت ہوتی ہے اور اس بغاوت کے پیچھے سخن فہمی کا ایک نیا شعور بھی ہوتا ہے مگر سخن فہمی کا معیار قابلِ اطمینان ہو تو دودھ اور پانی کا فرق ملحوظ رہتا ہے ورنہ دودھ کو پانی اور پانی کو دودھ کہنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔

کلیم الدین کو اردو میں تنقید کا وجود فرضی نظر آیا۔ غزل ان کے نزدیک نیم وحشیانہ صنفِ شاعری ہے۔ کلیم الدین نے سخن فہمی کے بجائے طرفداری سے کام لیا، مگر ان کے ان چونکا دینے والے جملوں کے پیچھے ایک تنقیدی شعور ہے جس میں انتہا پسندی ہے، مگر جس کی اہمیت مسلم ہے۔ اسی لئے تذکروں کے تحسینی یا تعریفی کلمات سے تنقید

---

[1] نظر اور نظریے، ۸۸ — ۱۱۸

کا ایک سلسلہ دریافت کر لینا یا غزل کو اُردو شاعری کی آبرو کہہ کر خوش ہو لینا دوسری طرفداری ہو گی، سخن فہمی نہ کہلائے گی۔ سخن فہمی کے معنی اس سیاق و سباق میں یہ ہوں گے کہ ہم تھوڑی دیر کے لئے اس بات پر زور دینا چھوڑ دیں کہ ہمیں کیا چیز پسند ہے بلکہ یہ دیکھیں کہ اچھی چیز کیا ہے۔ میں اپنے طلبا کو ہر سال دو نقادوں کا قصہ ضرور سُناتا ہوں۔ ایک نے کہا یہ کتاب مجھے پسند ہے اور اچھی ہے۔ دوسرے نے کہا گو یہ کتاب مجھے پسند نہیں، مگر اچھی ہے۔ ظاہر ہے دوسرا بہتر نقاد تھا اس کے پاس اچھائی کا ایک معروضی معیار تھا۔

اگر اپنی پسند کے مسئلے کو دیکھا جائے تو اُردو تنقید کا کارنامہ بہت وقیع ہے، اور اگر اچھی چیز کے سلسلے میں جو کچھ کہا گیا ہے اس پر نظر ڈالی جائے تو ہمیں ایک بے اطمینانی محسوس ہوتی ہے۔ سیدھے سادے الفاظ میں تأثراتی لے کے لحاظ سے ہم ایسے گئے گذرے نہیں ہیں۔ ہاں فلسفۂ جمالیات کے لحاظ سے ابھی ہم کوئی قابلِ فخر کارنامہ پیش نہیں کر سکے۔

اُردو میں تنقید کی ابتدا آزاد اور حالی سے ہوئی۔ دونوں کی تنقید۔ دراصل اُن کی شاعری کی مقبولیت کے لئے ایک نیا احساس پیدا کرنے کی کوشش سے ہوتی ہے مگر اس سے آگے بھی جاتی ہے۔ ہمارے زمانے میں ایلیٹ کی تنقید، ہنری جیمس کی تنقید اور ڈی۔ ایچ۔ لارنس کی تنقید بھی اسی قسم کی ہے۔ عظمت اللہ خاں، اقبال، راشد اور میراجی کے یہاں بھی یہ بات ملتی ہے۔ اس نکتے کو ملحوظ رکھا جائے تو کئی دلچسپ باتیں خود بخود واضح ہو جاتی ہیں۔ حالی اور آزاد کو ایک نئی قسم کی شاعری کرنا تھی جس کے لئے ایک جواز کی ضرورت تھی۔ آزاد کی تنقید صرف جواز کی حد تک رہ گئی۔ حالی کی خوبی یہ ہے کہ ان کی تنقید جواز سے شروع ہو کر ایک ادبی دستاویز تک پہنچتی ہے مگر آج بھی ہم اس کو صحیفۂ آسمانی سمجھ کر سینے سے لگائے ہیں

تو اس سے حالی کا کچھ نہ بگڑے گا، ہاں ہمارے ذوق کی صحت مشتبہ ہو جائے گی۔
حالی نے سماج اور ادب کے رشتے کو واضح کر کے ہم پر احسان کیا۔ انھوں نے سادگی، اصلیت اور جوش پر جو زور دیا وہ بھی کچھ ایسا غلط نہ تھا۔ بیچل شاعری کے متعلق بھی اُن کے خیالات نظر انداز نہیں کئے جا سکتے، غزل، مرثیے اور مثنوی پر تبصرے میں بھی انھوں نے بعض بڑے پتے کی باتیں کہی ہیں، مگر حالی کے یہاں مُصلحِ ادیب پر غالب ہے، اس لئے وہ شاعری کو اخلاق کا نائب مناب اور قائم مقام کہتے ہیں غزل کے جمالیاتی تجربے پر غور نہیں کرتے۔ شوق لکھنوی کی روشن تصویروں کو تاریکی کے دھبے قرار دیتے ہیں۔ حالی پھر بھی ایک بڑے نقاد اس لئے ہیں کہ ان کے یہاں ادب کے تصوّر کے پیچھے تہذیب کا ایک پس منظر اور تہذیب کے پس منظر میں زندگی کا ایک شعور ہے۔ اس لئے حالی کی روایت ایک اچھی روایت ہے، مگر روایت کی طرح اسے آنکھ بند کر کے تسلیم کر لینا خطرناک ہے۔ حالی سخن فہمی کا ایک معیار ضرور بتاتے ہیں مگر اس معیار کو ہم اب یک رُخا پاتے ہیں۔ اس میں ادب کے مرکزی مسئلے یعنی فن کے مسئلے کے ساتھ انصاف نہیں کیا گیا

وحید الدین سلیم اور عبدالحق اہم نقاد نہیں گو قابلِ ذکر ضرور ہیں۔ انھوں نے حالی کی طرح کوئی نئی بصیرت عطا نہیں کی، ہاں حالی کے اصولوں کو کامیابی سے برتا۔ عبدالحق ہمارے پہلے بڑے تبصرہ نگار ہیں محقق کی حیثیت سے بھی ان کا درجہ بلند ہے۔ ان کے اسلوب کی بھی اہمیت ہے مگر ان کی تنقیدیں حالی کے دبستان کی ایک کڑی ہیں۔ وحید الدین سلیم غزل کے متعلق حالی کے خیالات کی تشریح کرتے ہیں، اس لئے میرا اور ذوق کے متعلق ان کے ارشادات قابلِ قدر ہیں، مگر ان میں کوئی نیا فکری موڑ نہیں ہے۔ یہ فکری موڑ ہمیں عظمت اللہ خاں کے یہاں ملتا ہے۔

عظمت اللہ خاں کی تنقید بھی ان کی شاعری کے جواز سے شروع ہوئی اور اس کی

خوبی یہ ہے کہ وہ بنیادی طور سے رومانی اور بریڈلے سے متاثر ہونے کے باوجود ہماری شاعری کے موضوعات اور اسالیب دونوں میں ایک اہم اضافے کا باعث ہوئی۔ حالی سے حقیقت پسندی کی جو لے شروع ہوئی تھی عظمت اللہ خاں کے یہاں وہ ہندوستانیت کے ایک دستور العمل میں ظاہر ہوتی ہے مگر حالی اور عظمت اللہ خاں دونوں کی تنقید میں دو علیحدہ بصیرتوں کی نمائندہ ہیں اور دونوں کے ساتھ دور تک نہ جاتے ہوئے ہم دونوں سے مدد لے سکتے ہیں۔ عظمت اللہ خاں، ادب کے جمالیاتی پہلو کے حالی سے زیادہ قائل ہیں۔ انھوں نے نئے فکر کے ساتھ نئے فارم کی ضرورت پر بھی زور دیا ہے غزل کے معاملے میں ان کا لہجہ زیادہ سخت ہے اس لیے کہ انھوں نے حالی سے زیادہ گہری نظر اس کی بے ہیئتی پر ڈالی ہے۔ میرا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ جو غزل کا جتنا مخالف ہے اتنا ہی اچھا نقاد ہے، ہاں شاعری کی زبان کے سلسلے میں انھوں نے زیادہ معنی خیز پہلوؤں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ بہرحال حالی کے مقابلے میں عظمت اللہ خاں مغربی ادب سے زیادہ واقفیت رکھتے تھے اور ہندی ادب پر بھی اُن کی نظر زیادہ گہری معلوم ہوتی ہے —— وہ حسن کے نئے معیار سامنے لاتے ہیں اور یہ معمولی بات نہیں۔

اسی زمانے میں رسوا کے قاموسی ذہن کا کرشمہ چند مقالات کی روشنی میں ظاہر ہوا۔ رسوا در اصل ایک عالم اور فلسفی تھے مگر انھوں نے ناول بھی لکھے اور شاعری بھی کی اور چند ادبی مقالات کے ذریعے سے ادب کے جمالیاتی پہلو پر بھی روشنی ڈالی۔ افسوس ہے کہ ان مضامین کا کوئی خاص اثر ہماری تنقید پر نہیں پڑا لیکن ان کے مطالعے سے یہ ضرور ثابت ہو جاتا ہے کہ رسوا اگر اس سلسلے کو جاری رکھتے تو شاید بیسویں صدی کی چوتھی اور پانچویں دہائی میں ترقی پسند تحریک کا سیلاب اس طرح ساری ادبی بساط پر محیط نہ ہو جاتا۔

ترقی پسند تحریک کے متعلق سیلاب کا لفظ استعمال کرنے سے شاید —— یہ خیال

ہو کہ میں اُسے مضر سمجھتا ہوں، ایسا نہیں ہے۔ مجموعی طور پر اُس کے اثر سے تنقید بہت آگے بڑھی اس نے ادب کے متعلق بنیادی سوال اُٹھائے اور اُن کا جواب دینے کی کوشش کی۔ اس نے ادب کے مطالعے میں تاریخ اور تہذیب کے اثرات پر زور دیا۔ اس نے سماجی تبدیلیوں کا احساس دلایا۔ اس نے تنقید کو علمی اور سائنسی بنایا۔ اس نے فکر اور فن کے رشتے پر غور کیا۔ یہ تحریک چند عالمگیر اثرات کا نتیجہ تھی اور اس کے ذریعے سے ہم دنیا کے ذہن سے بھی آشنا ہوئے۔ اسی نے ہمارے ادب کے ہر شعبے پر اثر ڈالا اور نئے لکھنے والوں کو ایک عقیدہ، ایک منزل اور ایک ولولہ نہ دیا۔ لیکن سخن فہمی کی یہ نئی لے بہت جلد طرفداری کے ایک ناروا مظاہرے میں بدل گئی۔ اس میں ادب سے زیادہ ترقی پسندی پر زور دیا گیا اور ترقی پسندی کے معنی اشتراکی نظام سے کم و بیش وابستگی کے لئے گئے۔ اس میں وقتی اور ہنگامی مصلحتوں کو ادبی ضرورت پر ترجیح دی گئی۔ اختر رائے پوری کے یہاں اس نے اقبال اور ٹیگور کی شاعری کو بعض رجعت قرار دیا اور اکبر کے کلام کو طنزیہ تک بندی ٹھہرایا۔ اس نے شروع شروع میں نئے پن کے جوش میں کلاسیکی ادب کو اس طرح نظر انداز کیا جس طرح اوّل اوّل روس کے انقلابیوں نے ٹالسٹائی کی عظمت سے انکار کیا تھا۔ اس نے ادب کی اپنی، سماج کی تخیلی تصویر پر توجہ نہ کی، ادب کو سماجی دستاویز بنانا چاہا۔ مگر جب ابتدائی تبلیغی جوش کے بعد اُس میں کچھ گہرائی آئی تو اُس نے کاڈویل کے اثر سے ادب کے جذباتی پہلو کو بھی تسلیم کر لیا۔ ترقی پسند تنقید کے سب سے اچھے نمونے ہمیں مجنوں اور احتشام حسین کی تنقیدوں میں ملتے ہیں۔ دونوں ہی مارکس کے تاریخی مادیت کے فلسفے سے متاثر ہیں اور اس کے بعد جدلیاتی طریق کار کی اہمیت کو مانتے ہیں مگر دونوں کے یہاں تاریخی شعور کے ساتھ کلاسیکی ادب کی عظمت کا اعتراف اور ادب کے جمالیاتی پہلو کا احساس ہے۔ گو مجنوں کے یہاں یہ پہلو زیادہ واضح ہوتا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ احتشام حسین

کے یہاں نظریاتی مضامین زیادہ وقیع ہیں اور مجنوں کے یہاں ہمارے کلاسیکل شعرا پر مضامین۔ افسوس ہے کہ ہماری ترقی پسند تنقید کو کوئی لوکاچ نہ ملا۔ ممتاز حسین کے بعض مضامین میں کاڈول کی اوّعائیت ملتی ہے لیکن لوکاچ نے جس طرح مارکسی جمالیات پر روشنی ڈالی ہے یورپ میں حقیقت پسندی کی تحریک کی جو تفسیر و تعبیر کی ہے اور گوئٹے کے فن کی جو ترجمانی کی ہے وہ ہمارے یہاں ناپید ہے۔ ترقی پسند تنقید اگر سیاسی تنظیم سے اور آزاد ہوتی تو متوسط طبقے پر اثر جانے کے لئے میراجی اور منٹو کو اتنی جلد گیا گزرا قرار نہ دے دیتی اور راشد کے تجربوں کی ندرت کو اور اہمیت دیتی اور نہ جوش کی سطحی عقل پرستی سے مرعوب ہو کر قبلہ رنداں جہاں اور اپنی صدی کا حافظ و خیام قرار دیتی۔ ترقی پسند تحریک کی سطحیت اقبال اور جوش کے متعلق اظہارِ خیال میں ظاہر ہوتی ہے۔ اقبال کے یہاں ہمیں آفاقی ذہن ملتا ہے۔ ان کے یہاں عقل و عشق سادہ اور یک رنگ علامات نہیں۔ بڑے گہرے بلیغ اور جامع اشارات ہیں۔ وہ محض ماضی پرست نہیں۔ ان میں بقول اقبال سنگھ کے حال کے درد و کرب کا بھی گہرا احساس ہے۔ انھوں نے نظم کو جو گھٹنوں چل رہی تھی غزل کے برابر لا کھڑا کیا اور غزل کی بھی کایا پلٹ دی۔ ان کے مذہبی اور اخلاقی اور ماورائی رجحانات سے چڑ کر ترقی پسند تحریک نے شروع میں ان کا اعتراف معمولی طور پر کیا مگر جوش کی اکڑفوں میں انقلابی ذہن دیکھ لیا۔ جوش کے یہاں در اصل ایک باغیانہ ذہن ہے جو رومانیت کے بتِ ہزار شیوہ کی عشوہ طرازی ہے۔ ان کا تاریخ کا شعور سیاہ اور سفید لکیروں کا ہے۔ اقبال کے یہاں جذبے کی گرمی ہے اور لفظ جذبے کو بھائے ہوئے ہیں۔ جوش کے یہاں الفاظ کا نشہ ہے اور طاقت کی طرح الفاظ کا نشہ بھی خطرناک ہوتا ہے۔ اس لئے میں کہتا ہوں کہ اس صدی کی سب سے بڑی ادبی تحریک جس میں سخن فہمی کے لامحدود امکانات تھے ادب سے گہری وفاداری نہ ہونے کی وجہ سے طرفداری کے ایک نادر امظاہرے میں تبدیل

ہو گئی۔ اس نے فارمولے کا ادب پیدا کیا اور خود ہی اسے رد کر دیا۔ اس نے آج شہرت عطا کی اور کل چھین لی۔ اس نے ہر ذرّے کو آفتاب سمجھا اور گو کچھ آفتاب و ماہتاب پاس سے گزرے مگر یہ سحر کا انتظار کرتی رہی۔

اسی زمانے میں تنقید میں تحلیلِ نفسی کے اسرار و رموز سے بھی کام لیا جانے لگا۔ میراجی نے "ادبی دنیا" میں بعض شعرا کی نظموں کے مطالعے سے ان کی نفسیات کے خط و خال مرتب کئے۔ ان مضامین میں اختر انصاری کا مطالعہ بہت دلچسپ تھا۔ مارکسی نقاد تو بیسویں صدی کے ایک پیغمبر کے قائل تھے اس لئے ان کے مضامین میں زیادہ تر فرائڈ کے نظریات کی سطحیت کو ہی واضح کیا گیا۔ رچرڈسن نے جس طرح سے نفسیات کی مدد سے معنی و بیان کے ایک نئے رشتے پر زور دیا۔ اس پر کوئی توجہ نہیں ہوئی۔ شبیہ الحسن نے تنقید و تحلیل میں میر و غالب کے اندیشہ ہائے دور و دراز ڈھونڈ نکالے مگر فرائڈ، ایڈلر اور ینگ کی مدد سے فن کار کی شخصیت کا کوئی مکمل مطالعہ اب تک ہمارے سامنے نہیں آیا۔ ایک لحاظ سے یہ اچھا ہوا کیونکہ حال میں جس طرح فن کے آداب کو نظرانداز کر کے فن کار کی شخصیت کے پیچ و خم پر زیادہ زور دیا جا رہا ہے اسے دیکھتے ہوئے ترقی پسند تنقید کا تحلیل نفسی کے معروضات کو بہت اہمیت نہ دینا زیادہ وقیع معلوم ہوتا ہے۔ ترقی پسند تنقید کا یہ کارنامہ کیا کم ہے کہ بہرحال اُسے فن، فنکار سے زیادہ لائقِ توجہ معلوم ہوتا ہے۔

لیکن اس سلسلے میں سب سے زیادہ کوتاہی یہ ہوئی کہ جمالیات پر توجہ نہ ہوئی۔ مارکسی نقادوں نے موضوع کی اہمیت پر زیادہ زور دیا، تاریخی اور تہذیبی عوامل بیان کیے، اقتصادی رشتوں کی نوعیت واضح کی، سامنتی تمدن اور سرمایہ دارانہ دور کی میکانیکت کا ذکر کیا، فکر اور فن کی وحدت کی طرف بھی اشارہ کیا اور ہیئت پرستی کی خامیاں بھی گنوائیں مگر حسن کے متعلق یہ کہنا کافی سمجھا کہ "ہمیں حسن کا تصور بدلنا ہوگا"

مجنوں نے جمالیات کی تاریخ ضرور لکھی جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھیں اس مسئلے کی اہمیت کا احساس تھا۔ مگر مارکسی نقطۂ نظر سے جمالیات پر کوئی کتاب نہیں لکھی گئی۔ ممتاز حسین نے اپنے بعض مضامین میں استعارے کی اہمیت پر روشنی ڈالی، مگر مجموعی طور پر ترقی پسند تنقید حسن کے معیار واضح کرنے سے زیادہ ادب کی تعبیر و تفسیر اسی طرح کرتی رہی کہ اس سے زندگی کو بدلنے میں مدد ملے۔ ترقی پسند تنقید کی وجہ سے یہ تو ہوا کہ تاریخ، تہذیب، اقتصادیات، سیاست کے اہم نظریوں پر کسی نہ کسی طرح بحث ہوتی رہی، مگر اس نے اول تو فلسفے کو زیادہ تر آدرشی کہہ کر اس سے بے نیازی برتی، دوسرے اس نے جمالیات کے فلسفے پر فن برائے فن کی مہر لگا دی۔ ظاہر ہے کہ جمال پرستوں کے بیشتر خیالات یا تو اسی ذیل میں آتے ہیں، یا پھر حسن کو خیرباد کہہ کر اخلاقی مقاصد کی ترجمانی کرتے ہیں، مگر جمالیات کا علم جدید دور میں خاصا آگے بڑھا ہے اور اس کے اثر سے فنونِ لطیفہ کے مجموعی رول کی بہتر ترجمانی ہوئی ہے، یہاں تک کہ کلائیو بیل اور کالنگ ووڈ سے آسبورن تک ہمیں ایسے افکار نظریات مل جاتے ہیں جن میں فن کی خصوصیات کا خاصا جامع احساس ہے اور اسے صرف اظہار یا وجدان کہہ کر ٹالا نہیں گیا ہے۔

اردو تنقید میں کلیم الدین کی ایک خاص اہمیت ہے اور انھیں محض مغرب کا اندھا مقلد اور مارکسی تنقید کا کٹر مخالف کہہ کر ٹالا نہیں جا سکتا۔ کلیم الدین ایف۔ آر۔ لیوس کے شاگرد ہیں۔ لیوس کی طرح ان کے ہاں ادب کے ایک انسانی اور اخلاقی پہلو سے گہری شیفتگی ہے۔ ان کے یہاں CLOSE STUDY کی SCRUTINY یعنی گہرے اور غائر مطالعے کی روایت ہے اور اس کے ساتھ ایک ادعائیت اور بت شکنی بھی ہے جو بعض اوقات ناگوار بھی ہوتی ہے لیکن ان کی انتہا پسندی سے چڑنے کے بجائے اگر ان کا سنجیدگی سے مطالعہ کیا جائے تو عالمی معیاروں کے مطابق ان کی

اردو ادب کو پرکھنے کی کوشش مستحسن ہے۔ گو ان کی یہ کوتاہی نظر انداز نہیں کی جاسکتی کہ انھوں نے ان تاریخی عوامل اور تہذیبی پس منظر کو اہمیت نہیں دی، جس کے مطابق اُردو ادب کا نشو و نما ہوا ہے پھر بھی غزل پر ان کا اعتراض دوسروں کے اعتراضات سے اس لئے زیادہ وزنی ہے کہ انھیں اس میں اس فارم کی کمی محسوس ہوتی ہے جس کے بغیر فن لطیف کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ کلیم الدین نے "اُردو تنقید پر ایک نظر" میں بھی بہت سی کام کی باتیں کہی ہیں۔ لیکن میرے نزدیک ان کا سب سے بڑا کارنامہ "عملی تنقید" ہے۔ غزل کے جواز میں جاپانی شاعری ہائیکو کی مثال دی جاتی ہے۔ کلیم الدین نے واضح کیا ہے کہ "ہر ہائیکو شعر کی طرح بجائے خود آزاد اور مکمل اکائی ہے اور آزاد اور مکمل اکائیوں کو ایک جگہ اکٹھا کرنا (جس طرح غزل میں کیا جاتا ہے) تحصیل حاصل ہے، ایک قسم کی نادانی ہے۔" پھر انھوں نے جدید و قدیم غزل گویوں کے کلام سے کچھ مثالیں لے کر ان پر مفصل تنقید کی ہے۔ اس کتاب میں کلیم الدین نے میر، مصحفی، غالب، مومن، حسرت، فانی جیسے بعض شعرا کے تخیلی تجربات کی تعریف کی ہے اور اُردو کے شعرا کے متعلق یہاں تک لکھتے ہیں: "یہ نہیں کہ اُردو شاعروں کو تجربوں پر دسترس نہیں، ان کے تجربوں میں شدت بھی ہوتی ہے اور گہرائی بھی اور کبھی کبھار پیچیدگی بھی۔ وہ جذبات کے ترجمان ہیں اور غور و فکر بھی کرتے ہیں۔ نئی نئی باتیں کرتے ہیں یا نئے ڈھنگ سے کرتے ہیں لیکن غزل کی روایات کچھ ایسی ہی ہیں کہ اردو شعرا کو وہ کامیابی نہ ہوئی جس کے وہ اہل تھے۔"

دراصل غزل کی آمریت پر پہلی کاری ضرب ترقی پسند تنقید نے لگائی اور پھر کلیم الدین نے، ترقی پسند تنقید نے تو ادب میں روایت کی اہمیت کے پیش نظر غزل کو گوارا کر لیا، لیکن کلیم الدین بعض غزل گویوں کی خوبی کا اعتراف کرنے کے باوجود ابھی تک غزل کے مخالف ہیں گو ان کی مخالفت میں اگلی سی شدت نہیں ہے۔ اس

سلسلے میں ایک بنیادی غلطی ترقی پسندوں اور کلیم الدین دونوں سے ہوئی ہے۔ کسی زبان کے ادب کو اس کی روایت سے یکسر علیٰحدہ نہیں کیا جاسکتا ہاں روایات میں اصلاح و ترمیم کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ جوش غزل کے بڑے مخالف ہیں مگر ان کی نظموں میں تعمیری حُسن کم ہے غزل کی سی علیٰحدہ علیٰحدہ تصویریں زیادہ ہیں۔ جدید اُردو تنقید نے مجموعی طور پر غزل کو اسٹیج کے مرکز سے ہٹا کر اور دوسرے اصناف سخن کی طرف توجہ دے کر ایک توازن قائم کیا ہے۔ غزل کی مقبولیت نے ادبی مزاج پر اثر ڈالا تھا جس سے نظم و نثر کے تمام اصناف متاثر ہوئے تھے۔ جدید تنقید نے نظم کی اہمیت پر زور دے کر مسلسل اور مربوط بیان کی خوبی کو واضح کر کے زبان کے بنیادی مسئلے یعنی جذبے کے موزوں و مناسب اظہار کی طرف توجہ دلا کر غزلیت کی لے کو کم کیا ہے۔ پھر اس نے بول چال کی زبان کے اس جاندار پہلو کی طرف اشارہ کر کے جس کو غزل کی مرصع سازی نے کم منہ لگایا تھا، نظم میں تجربات کے معنی خیز پہلوؤں کی نشان دہی کی ہے۔ بے قافیہ اور آزاد نظم کو غزل اور مروجہ نظم کے دوش بدوش لا کھڑا کر دینے میں جدید تنقید نے ایک صحت مند رول ادا کیا ہے چنانچہ غزل نے اس دور میں نئے احساس کی ترجمانی کی اپنے طور پر کوشش کی ہے اور اس کے ساتھ نظم میں تجربوں نے نظم کی زبان کو احساس کی تھرتھراہٹ کے ساتھ اور قافیے اور ردیف کی سخت گیری سے آزاد ہو کر چلنا سکھایا ہے۔ راشد، میراجی اختر الایمان کی شاعری اس طرح ایک محدود اور مخصوص لے نہیں رہی، ایک بھرپور میلان بن گئی ہے جس کے ذریعے سے جدید احساس شاعری بن کر داہ واہ کی پھوہار کی نذر نہیں ہوتا فکر کے لئے نئے نئے گوشے فراہم کرتا ہے اور ہر بات کو اشاروں میں بیان کرنے اور ہر شے سے کوئی اور شے مراد لینے کے بجائے آج کے دور کے سوز و ساز اور زخمی احساس کی ترجمانی کرتا ہے۔

ہر ادب میں بہت عرصے تک تنقید شاعری کی تنقید رہی ہے اور آج بھی ہے لیکن کسی زبان کے سرمائے کو اس معیار سے بھی دیکھنا ضروری ہے کہ اس میں نثر اور اس کے اصناف پر تنقید کا سرمایہ کتنا اور کیسا ہے۔ گذشتہ تیس سال میں شاعری کے حقیقی عناصر، اظہار کے سانچوں، شاعری کی زبان پر بحث کے علاوہ، نثر کی بنیادی خصوصیات پر بھی توجہ ہوئی ہے، گو ابھی اس سلسلے میں مدلل اور مفصل کارنامے سامنے نہیں آئے۔ کچھ دن پہلے تک غزل کے اثر سے ہمارے اچھے اچھے شعرا نثر کی چند سطریں سیدھی طرح نہیں لکھ سکتے تھے اور ان کے اپنے اور دوسروں کے کلام کے متعلق اشارات کچھ ایسی زبان میں ہوتے تھے کہ لوگوں کو لطف تو آجاتا تھا مگر ان کی سمجھ میں بات کم آتی تھی۔ جگر ایک اچھے شاعر تھے مگر جب 'ساقی سے خطاب' سنانے لگتے تھے تو اپنے ساقی کے مرتبے کے متعلق ایسی تقریر کرتے تھے جس کا مطلب سمجھ میں نہ آتا تھا اور گھبرا کر ہم لوگ کہا کرتے تھے کہ حضرت نظم سنائیے۔ سرسید کی تحریک نے اردو نثر کو سرمایہ دار بنایا، مگر نثر اور اس کے مختلف اصناف پر تنقید حال کی چیز ہے اور مجموعی طور پر دیکھا جائے تو ضرورت کے لحاظ سے کم ہے۔ ہنری جیمس نے جس طرح ناول پر تنقید کے لئے اصول مرتب کیے ہیں، ڈی۔ ایچ۔ لارنس نے جس طرح ناول اور ادب پر اظہار خیال کیا اور اس طرح اپنے دور کے شعور کو متاثر کیا اس کی مثالیں ہمارے یہاں خال خال ہیں۔ پریم چند نے کچھ مضامین میں بعض اہم نکات کی طرف اشارہ کیا ہے، مگر پریم چند بھی اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کی طرف خود نہیں آئے بلکہ ترقی پسند تحریک انھیں لائی جسے پریم چند کی شخصیت اور ان کے فن سے ایک کام لینا تھا۔ چنانچہ اگر کوئی یہ کہے کہ آج کا دور شاعری سے زیادہ نثر کا دور ہے اور انسانی روح کی ترجمانی کے بہت سے وہ پہلو جو پہلے شاعری کی ملکیت تھے اب نثر کے دائرۂ اختیار میں آگئے ہیں تو غلط نہ ہوگا۔ ہماری جدید تنقید نے

نثر کی افادیت کو محسوس تو کیا ہے مگر اس افادیت سے ابھی مناسب کام نہیں لیا۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ افسانے کے خاصے معتدبہ سرمائے اور چند قابل ذکر ناولوں کو چھوڑ کر جدید اُردو کا کوئی بڑا کارنامہ نہیں ہے، مگر نقادوں نے اس نکتے پر غور نہیں کیا کہ حقیقت پسندی کی وہ لہر جو اچھی نثر کے لئے فضا ہموار کرتی ہے اُردو میں دیر میں شروع ہوئی اور گرد و پیش کی دُنیا سے وہ واقفیت جو بالآخر زندگی اور اُس کے متنوع مظاہر کی عکاسی کو کے ہمارے ذہن کو وسیع بھی کرتی ہے اور اس میں بالیدگی بھی پیدا کرتی ہے بہت حال کی چیز ہے۔ میں نے دہلی کے ایک مشہور ہندی ناشر سے دریافت کیا کہ دیوناگری رسم خط میں اُردو کے ادب کا کون سا حصہ مقبول ہوتا ہے تو اس نے قدیم و جدید شاعری، چند ناولوں اور بیشتر اُردو افسانوں کا نام لیا لیکن سوانح عمریوں، مضامین، طنز و مزاح، تاریخوں، خود نوشت اور فسلی خاکوں کا ذکر نہیں کیا۔ جدید نقادوں نے ناول کی کمی پر افسوس کر کے ناولوں کے لکھنے کی طرف توجہ ضرور دلائی ہے مگر اس حقیقت کو پورے طور پر محسوس نہیں کیا گیا کہ حقیقت پسندی اور عقلیت کی لہر جو سادہ، جاندار اور کارآمد نثر کی ترقی کی ضامن ہوتی ہے زیادہ تر سیاسی یا رومانی وادیوں میں اسیر رہی، کھل کر اپنے حسن سے مست ہو کر، اپنی خاطر سامنے نہیں آئی، اس لئے جدید تنقید کو نثر کی تنقید کی طرف اور توجہ کرنا ہے اور جس طرح کلیم الدین نے عملی تنقید میں غزل اور نظم کے کچھ نمونوں کو لے کر ان کا تجزیہ کیا ہے اس طرح نثر کے نمونوں کا بھی تجزیہ کرنا ہے تاکہ ہم نثر کے امکانات سے اور کام لے سکیں اور سخن ہائے گفتنی کا یہ بار شاعری کے کندھوں پر نہ ڈال دیں۔

گذشتہ تیس سال میں ہماری تحقیق نے خاصی ترقی کی ہے اور اس کے اثر سے ہماری ادبی تاریخ کے بہت سے تاریک گوشے منور ہو گئے ہیں اور بہت سے دوسرے

درجے کے شعرا سے ہم زیادہ واقف ہو گئے ہیں۔ تحقیق تنقید کے لئے بنیاد کا کام دیتی ہے اور یہ واقعہ ہے کہ نقاد تحقیق سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ لیکن تحقیق تنقید نہیں ہے اور نہ تحقیق کے قابلِ قدر سرمایے کی بنا پر کوئی نقادوں کی صف میں داخل ہو سکتا ہے۔ آزادی کے بعد کے عہد کا ایک کارنامہ یہ ہے کہ اپنے ادبی سرمایے پر کسی مذہبی یا اخلاقی یا سیاسی نظریے سے نہیں مگر اسی سرمایے کی خاطر یا اپنی بنیاد اور میراث سے زیادہ واقف ہونے کی خاطر علمی نقطۂ نظر سے توجہ ہوئی ہے اور گو اردو کو بعض سیاسی مصلحتوں کی وجہ سے بعض ریاستوں میں اس کا حق نہیں ملا لیکن تعلیم گاہوں اور علمی اداروں اور رسالوں میں تحقیق کی طرف جو میلان ہے وہ آزادی اور اس کے عطا کئے ہوئے وسائل کی دین ہے۔ ظاہر ہے کہ تحقیق جو معروضیت عطا کرتی ہے اس کی ہمیں اور ضرورت ہے لیکن ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیے کہ پرانے مصنفین کے متن کی صحت کے علاوہ جس کی اہمیت مسلم ہے، پرانے مصنفین کے حالات کی اہمیت ادبی تنقید میں صرف اس حد تک ہے کہ اس کے علم سے ہمیں مصنف اور اس کی تصنیف کو سمجھنے میں کچھ مدد ملتی ہے۔ مگر ان حالات کی بنا پر تصانیف کے اشارات کو آیت حدیث کی طرح مان لینا صحیح نہیں۔ فن کبھی زندگی کی بجنسہٖ نقالی نہیں ہوتا۔ اس کی صداقت زندگی کے واقعات کی صداقت سے مختلف ہوتی ہے اس میں تخیلی تجربے کی صداقت کا سوال اہم ہوتا ہے اس لئے سوانحی نقطۂ نظر ادبی مطالعے میں ایک حد تک حارج ہوتا ہے کیونکہ یہ ادبی روایت کے تسلسل کو ایک فرد کی زندگی کے واقعات کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کرتا ہے۔ ہمارے غزل گو شعرا کی زندگی کو ان کی غزلوں میں تلاش کرنا خصوصاً بہت خطرناک ہے۔ فن فنکار کا خواب بھی ہوتا ہے اور نقاب بھی اور یہ فرار کا راستہ بھی ہو سکتا ہے۔ اس لئے فن کار کے حالاتِ زندگی اور اس کے دور کے اہم میلانات سے واقفیت ہماری مدد کرتی ہے، مگر مرکزی حیثیت خود فن کی ہے جس کی اپنی ایک

زندگی ہے اور جسے ہمیں تاریخی سماجی معیار سے دیکھنے کے بجائے مکمل اظہار کی حیثیت سے دیکھنا ہے۔ گذشتہ تیس سال میں تحقیق زیادہ تر تصانیف کے صحیح اور مستند ایڈیشن مرتب کرنے میں لگی رہی ہے جو ضروری ہے۔ یہ مختلف مخطوطات کی طرف توجہ دلاکر اور ان کا مقابلہ کرکے ایک مفید خدمت انجام دیتی رہی ہے مگر یہ جب تنقید کا فرض بھی ادا کرنے کی کوشش کرتی ہے تو گمراہ کن ہو جاتی ہے۔ تحقیق کبھی کبھی صرف قدامت کو، کبھی تعدد کو، کبھی اپنی دریافت کو اتنی اہمیت دیتی ہے کہ اس کی وجہ سے ادبی معیار مجروح ہوتے ہیں۔ مثلاً معراج العاشقین کی اہمیت اُردو نثر کی تاریخ میں مسلّم ہے۔ اس سے ہمیں اس میلان کا سلسلہ ملتا ہے جو بالآخر سب رس میں آکر ایک ادبی کارنامے کا باعث ہوتا ہے۔ معراج العاشقین کی ترتیب ایک علمی کارنامہ ہے اور ایسے علمی کارناموں سے ادب کو مدد ملتی ہے مگر اس کی وجہ سے سب رس کی اہمیت کم نہیں ہوتی۔ اس لئے تحقیق کی طرف موجودہ توجہ کو سراہتے ہوئے میں اس بات پر زور دینا چاہتا ہوں کہ تحقیق کی علمی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے تنقید سے اس کا موازنہ یا اس کے بل پر تنقید کی اہمیت کو کم کرنا کسی طرح درست نہیں بلکہ موجودہ دور میں تو تنقید کا کام اور مشکل ہو گیا ہے کیونکہ علم میں وسعت اور مختلف زبانوں کے ادبی معیاروں کے علم نے، فن کی اپنی خصوصیات اور اس فن کے دوسرے فنون سے رشتے اور اس کی تہذیبی اور ذہنی بساط پر جگہ متعین کرنے کا کام خاصا مشکل بنا دیا ہے۔ موجودہ تنقید صرف زبان و ادب سے واقفیت ہی نہیں، تاریخ تہذیب، فلسفیانہ افکار، سیاسی مسائل اور اور نفسیاتی حقائق سب کا علم و عرفان چاہتی ہے اور ظاہر ہے کہ یہ کام کسی طرح آسان نہیں کہا جا سکتا۔

گذشتہ تیس سال میں علمی و ادبی ذوق کے متعین کرنے میں رسالوں کا رول نہایت شاندار رہا ہے اور تنقید و تحقیق اور تبصرہ تینوں میدانوں میں ان رسالوں نے

ایک قابلِ قدر کام کیا ہے۔ رسالہ "اُردو" اور "نگار" کی خدمات کو اس سلسلے میں فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ ان رسالوں کے ذریعے سے اول تو سینکڑوں گمنام اور غیر معروف شاعروں اور ادیبوں کا تعارف ہوا ہے اور اُن کے کلام کے نمونے ہمارے سامنے آئے ہیں، دوسرے جانے پہچانے شعرا کی بہت سی تصانیف جو ابھی تک پردۂ خفا میں تھیں منظرِ عام پر آئی ہیں۔ تیسرے ان میں ہر قسم کے تنقیدی مضامین نکلے ہیں جن میں سے بعض نے نہایت قابلِ قدر خدمت انجام دی ہے۔ ان میں سے کئی رسالوں کے گرد اہلِ قلم کا ایک حلقہ ہے جس میں جانب داری اور وکالت اور ایک دوسرے کی پیٹھ کھجانے کا بھی مظاہرہ ہے مگر ان کے ذریعے سے نظریاتی اور عملی دونوں قسم کی تنقیدیں بہرحال سامنے آئی ہیں مگر سنجیدہ رسالوں کا بھی ایک خاصا سیلاب ہے لیکن اُنھوں نے بجائے ذوقِ سلیم کی اشاعت کے سستی مقبولیت یا نئی اور سہل الحصول شہرت عطا کی ہے اور اس طرح ذوق کو بلند کرنے کے بجائے اُسے پست کیا ہے۔ چونکہ رسالے نکالنے کی سہولتیں پہلے سے زیادہ ہیں اور پڑھنے والوں کا حلقہ بھی بہرحال سُست رفتاری سے سہی مگر بڑھ تو رہا ہے اس لئے ان میں تنقید سے یا تحسین یا تنقیص پر اور تبصرے سے زیادہ مدح یا قدح پر توجہ ہے۔

اس زمانے میں تبصرہ نگاری کے فن کو خاصی ترقی ہوئی ہے۔ رسالہ اُردو اور اردو ادب کے تبصرے عام طور پر تبصرے ہیں۔ ان میں صرف چند نام نہیں گنائے جاتے۔ پاکستان میں سویرا، نیا دور، صحیفہ اور فنون نے تبصرہ نگاری کا اچھا معیار قائم کیا ہے۔ نیا دور بنگلور اور سوغات بنگلور نے بھی اس سلسلے میں قابلِ قدر خدمات انجام دی ہیں۔ ہنری جیمس تو در اصل تبصرے کو تنقید کہنے کو ہی تیار نہیں ہے اور اس کا یہ خیال رسالوں کے بیشتر تبصروں اور کتابوں کے بیشتر مقدموں کے متعلق صحیح ہے کیونکہ ان میں ادب سے زیادہ اشتہاریت اور معیار سے زیادہ مدح سرائی ہوتی ہے

یہ کہنا بھی غلط نہ ہو گا کہ ان تبصروں نے ادب کے معیاروں کو بھی متاثر کیا ہے کیونکہ ہر چنگاری کو شعلہ اور ہر ذرّے کو آفتاب سمجھنے کی وبا خاصی عام ہو گئی ہے۔ تبصرہ نہ تو وہ کھونٹی ہے جس پر تبصرہ نگار اپنے خیالات کا لبادہ لٹکاتا ہے نہ یہ محض خوبیوں اور خامیوں کی طرف ایک اشارہ ہے۔ اس میں کس نے کہا، کیا کہا اور کیسے کہا، تینوں پہلوؤں کی طرف توجہ ضروری ہے۔ یہ سوچنے کی بات ہے کہ اُردو میں ابھی تک کوئی رسالہ ٹائمس لٹریری سپلیمنٹ کی طرح صرف اچھے تبصرے پیش کرنے کے لئے نہیں نکل سکا مگر اس معاملے میں تو غالباً ہندو پاک کی بیشتر زبانوں میں یہی رنگ ہے۔

تنقید اور تبصرے کے معیار کا گہرا تعلق پڑھنے والوں کے ذوق سے ہے اور اس سلسلے میں کچھ تلخ حقیقتوں کا تذکرہ ضروری ہے۔ جدید سرمایہ دارانہ دَور نے تجارتی مقاصد کو خاص طور سے فروغ دیا ہے اور اس لئے خونِ جگر کو بھی مالی تجارت بنانے کا طریقہ بہت عام ہے۔ قومی حکومت سے ہمیں یہ توقع تھی کہ یہ تمام قومی زبانوں کے فروغ پر یکساں توجہ دے گی۔ مگر بعض سیاسی اُلجھنوں کی وجہ سے ایسا نہ ہوا۔ بہرحال ہم صنعتی دور میں قدم رکھ چکے ہیں اور ایسا ایک بڑا طبقہ موجود ہے جس کے لئے تفریحی مواد کی ضرورت ہے۔ ادب سے مانوس ہونے کی وجہ سے لیکن ادب کے بلند مقام کو نہ سمجھتے ہوئے وہ اس تحریر کی طرف مائل ہوتا ہے جو دراصل ادب نہیں مگر جس کے اوپر ادب کا ایک غلاف ہے۔ یہ شاعر کا کلام نہیں پڑھ سکتا، اس کے مختصر انتخاب پر قناعت کرتا ہے۔ یہ علمی مسائل کو سمجھنے کے لئے وقت نہیں نکال سکتا، ہاں ان سے کچھ اوپری واقفت ضروری سمجھتا ہے۔ یہ اپنا بھرم رکھنے کے لئے جدید ترین دبستانوں اور مکاتبِ خیال سے بھی اپنی دلچسپی ظاہر کرتا ہے خواہ وہ تجریدی آرٹ ہو یا اسپیس ٹریول یا خلا میں پرواز کے مسائل۔ میں ایسے

رسالوں کی ضرورت کو تسلیم کرتا ہوں مگر ان کی علم و ادب کی ٹھیکیداری پر مجھے اعتراض ہے۔ ان رسالوں نے تنقید کو محض شخصیت کی شعبدہ بازی بنا دیا ہے اور فن سے زیادہ فنکار سے شغف کو فیشن۔ پھر فنکار کے یہاں اہم محرکات کی تلاش میں اس نے جو زمین آسمان کے قلابے ملائے ہیں اور رائی کا پہاڑ بنایا ہے اس کی وجہ سے ادبی معیاروں کو بڑا نقصان پہنچا ہے۔ بقول ہنری جیمس نودن کے شاہکاروں کی کثرت اور ہم عصری ادب کی حد سے بڑھی ہوئی سطحیت میں گہرا تعلق ہے۔ اس سطحیت میں زبان، حسن کاری کے آداب، خیال کی گہرائی، احساس کی تازگی سب مجروح ہوئے ہیں۔

تنقید بہر حال فن پاروں کی خصوصیات کی وضاحت اور ذوق کی صحت کا نام ہے اس میں تجربات کی پرکھ اور قدروں کا تعین دونوں پہلوؤں کے ساتھ انصاف ضروری ہے۔ اس کام کے لئے ادب کے معیار ضروری ہیں مگر کافی نہیں۔ کچھ زندگی کے معیار بھی یہاں ضروری ہو جاتے ہیں۔ بقول ایلیٹ ادب کا تعین تو ادبی معیاروں کے مطابق ہی ہو سکتا ہے مگر ادب میں عظمت کے لئے چیزے دگر کی بھی ضرورت ہے۔ اس میں ہمیں جدید امریکن نقادوں کے معیار کے بجائے بالآخر آرنلڈ، ایلیٹ اور رچرڈس سے کچھ معیار لینے ہوں گے اور اس کے ساتھ لوکاچ کے جمالیاتی تصور کو بھی ذہن میں رکھنا ہوگا۔ کہنا یہ ہے کہ تنقید بہر حال تہذیبی اور انسانی قدروں سے روگردانی نہیں کر سکتی اور اسی لئے مجھے اس میلان کے متعلق کہنا ہے جو حقیقت پسندی کے نام پر عسکری کے مضمون "انسان اور آدمی" اور سلیم احمد کے مضمون "نئی نظم اور پورا آدمی" میں ملتا ہے۔ ان دونوں مضامین میں کچھ انکشافات بھی ہیں مگر ان پر اعتراض یہ ہے کہ یہ دوسروں سے مختلف ہونے کے جذبے سے شروع ہوئے ہیں اور اس لئے ان میں ایک نیم پختہ ذہن کی بازی گری ہے۔ ہر نئی نسل پہلے پہلے اپنے آپ کو

پچھلی نسل سے مختلف ثابت کرنے کے لئے پچھلی نسل کی قدروں کو ہدفِ ملامت بناتی ہے لیکن کچھ عرصے کے بعد ان قدروں سے ایک نیا مفاہمہ شروع کر دیتی ہے۔ انسان کے بجائے آدمی کا آئیڈیل خواہ کیسی ہی حقیقت پسندی کیوں نہ ہو ادب کا آئیڈیل نہیں ہو سکتا۔ ادب آدمی سے انسان کی خاطر سروکار رکھتا ہے وہ آدمیت میں انسانیت کو دیکھتا اور دکھاتا ہے اور اس مقصد کی خاطر اسے انسانیت میں آدمیت کو بھی تسلیم کرنا پڑتا ہے مگر وہ آدمیت یا نچلے دھڑ کی اہمیت پر ساری توجہ مرکوز کر کے ادب نہیں رہ سکتا۔ ہاں اس سے شرمانے کی بھی اسے ضرورت نہیں۔ اس میلان کو پاکستان میں زیادہ ترقی ہوئی ہے اور غالباً اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ سیاسی بندشوں کی وجہ سے سیاسی اور سماجی مسائل پر اظہارِ خیال کے بجائے فکر کا رُخ جسم کو کریدنے اور جسم کی آنچ کو تاپنے میں لگ گیا ہے۔ اس روش نے تنقید کو بھی مَن کی موج بنا دیا ہے جس میں داستان سے زیادہ داستان سرا کو اہمیت حاصل ہے اور جس میں تنقید کے تاج محل کے بجائے انشائیہ ترنگ ہے۔ میں تنقید میں مَن کی موج کو یکسر نظر انداز نہیں کرتا، یہ تنقید نہ ہو بہر حال بجائے خود ایک تخلیق ہے اور نہیں ایک اور بصیرت عطا کرتی ہے۔ لیکن یہ بیشتر یک رُخی ہوتی ہے، یہ علمی اسلوب نہیں رکھتی، اسے معیاروں سے کوئی سروکار نہیں۔ یہ چونکا سکتی ہے اور کبھی کبھی لطف کا بھی باعث بن سکتی ہے لیکن ہے یہ ایک قسم کی شعبدہ بازی۔ تنقید کو شعبدے بازی سے کوئی سروکار نہیں ہونا چاہیے۔ کبھی یہ نچلے دھڑ کی بات کرتی ہے کبھی لاشعور کی بھول بھلیوں کی۔ کبھی ایک ایسی حقیقت پسندی کی جس میں یہ ستارہ ایک اندھی بستی ہے۔ کبھی یہ فارم کی دہائی دیتی ہے کبھی ٹیکنک اور کبھی صرف لہجے کی بات چھیڑتی ہے۔ اس کی ذہانت میں کلام نہیں مگر بقول لوکاچ جوائس کی ذہنی رَو کی مصوری ایک قسم کا نیچرلزم ضرور ہے مگر اس سے ہم اس دور کے انسان کی روح کو کیسے سمجھ سکتے ہیں۔ اسی طرح

کافکا کی اُداسی اور سارتر کی وجودیت کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے یہ کہاں لازم آتا ہے کہ جب تک ہم ان دونوں کے رنگ کو قبول نہ کرلیں ہرگز تنقید کا حق ادا نہیں کرسکتے۔

ہماری تنقید میں ایک کمی کا اعتراف ضروری ہے۔ بعض تاریخی اور معاشرتی حالات کی وجہ سے ادب کے مطالعے کے ساتھ فنونِ لطیفہ کے علم کی رہنمائی نہ ہوسکی۔ ہندوستان میں موسیقی، مصوری، بُت تراشی اور فنِ تعمیر کی شاندار روایات ہیں لیکن اُردو کے نئے ادیب کو ان روایات میں بھرپور حصّہ نہ ملا۔ یہی وجہ ہے کہ غالب تک جس طرح موسیقی کی روایات کا علم شعرا کے یہاں نظر آتا ہے وہ اس دور میں کم ملتا ہے۔ مصوری سے بھی یوں ہی سامس رہا ہے اور بُت تراشی اور فنِ تعمیر سے تو بہت کم واسطہ ہے۔ حال میں اس کمی کو دُور کرنے کی کوشش ہوئی ہے۔ چنانچہ نصرت، فنون اور صحیفہ میں فنونِ لطیفہ کی خصوصیات پر اچھے مضامین (نکلے اور) نکل رہے ہیں لیکن مجموعی طور پر اُردو تنقید نے فنونِ لطیفہ کی وحدت سے پُورا فائدہ نہیں اُٹھایا اور اس لئے حسن کاری کے آداب متعین کرتے وقت مصوری اور موسیقی اور فنِ تعمیر کے نئے نظریات سے مدد نہیں لی گئی۔ امریکہ کا نیا فنِ تعمیر جمہوریت کا فنِ تعمیر کہا جاتا ہے اور والٹ اور وہیٹمن کو اس کا پیغمبر بتایا جاتا ہے۔ اس میں نئی حقیقت مادہ نہیں مکان ہے۔ ڈی۔ ایچ۔ لارنس نے اشارہ کیا ہے کہ مارک ٹوین اور میل ویل کے یہاں راہ سے ہٹ جانے پر زور ہے جب کہ وہیٹمن کے یہاں کھلی سڑک پر۔ رائٹ نے اسی کھلی سڑک سے حرکت کی طرف قدم بڑھایا ہے اور لاکار بوسیر کے یہاں انسان فطرت کی طرف واپس آیا ہے۔ سوویٹ یونین میں بُت تراشی خاصی جاندار ہے اور اس کی جسامت میں عظمت کا احساس ہوتا ہے گویا ایک دیوتا نیند سے بیدار ہو رہا ہو۔ مصوری میں سیدھی سادی نقالی افسانہ ہوچکی، اب کبھی لکیروں، کبھی زاویوں

کبھی بظاہر عجیب و غریب تصویروں کے ذریعے سے حُسن کے نئے پہلو دریافت کئے جارہے ہیں اس لئے تنقید مقررہ سانچوں، بندھی ٹکی زبان، موضوع اور ہیئت کے خانوں سے نکل کر حُسن کاری کے نئے آداب سیکھنے اور سکھانے پر مجبور ہے۔ ہاں اس میں مغرب کی نقالی سے کام نہ چلے گا بلکہ اجنتا اور ایلورا، کنارک اور تاج محل، نارائن راؤ، فیاض خاں اور علی اکبر خاں چغتائی اور ستیش گجرال اور حُسن کے رموز و ایما کو بھی سمجھنا پڑے گا۔

سی۔ پی۔ اسنو نے دو تہذیبوں کی بحث میں اس خلیج کی طرف اشارہ کیا تھا جو آج کے ادیبوں اور سائنس دانوں کے درمیان حائل ہوتی جارہی ہے۔ اُس نے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ ادب میں اب بھی ماضی پرستی ہے اور مستقبل کی طرف لے جانے والے سائنس داں ہی ہیں۔ اسی وجہ سے لیوس کا عتاب اس پر نازل ہوا لیکن ٹرلنگ نے ایک مدلل مضمون میں یہ ثابت کیا ہے کہ اسنو کا یہ مطلب نہیں تھا کہ ادب ماضی پرست ہے یا عقلیت کے خلاف جذبہ اُبھارتا ہے۔ دراصل وہ اس بات پر زور دینا چاہتا تھا کہ سائنس نے جو علم انسان کو دیا ہے 'جو آفاقی اوزار دیئے ہیں' اس میں بین الاقوامی تعاون اور اشتراک کے جو امکانات ہیں اس کی روشنی میں ادب کو اس سے اور زیادہ قریب ہونا چاہیے۔ میں اس خیال سے اتفاق کرتا ہوں کیونکہ سائنس بجائے خود انسان دوستی کی طرف لے جاتی ہے۔ مگر صنعت و حرفت اسے جو اقتدار دیتی ہے اس کی وجہ سے وہ ادب کی قدروں کے بغیر انسانیت کے لئے خطرہ بن سکتی ہے اس لئے یہ ضروری ہے کہ ادب زبان کی صحت پر زور دے کر لفظ کی طاقت سے پُورا کام لے اور سائنس دانوں کو اس طاقت کا احترام سکھائے ورنہ لفظ کے احترام اور اس طرح خیال کی صحت کے بغیر پوری تہذیب بقول ایزرا پاؤنڈ خطرے میں مبتلا ہو سکتی ہے۔ بظاہر اس موقع پر یہ بات غیر متعلق معلوم

ہوتی ہے مگر تنقید نے ابھی تک لفظ کے صحیح استعمال پر پوری توجہ نہیں کی ہے۔ سب سے بڑی مثال اصطلاحوں کے استعمال میں ملتی ہے ہم SYMBOLISM کے لیے رمزیت اشاریت دونوں استعمال کرتے ہیں اور SYMBOL کے لیے علامت کا استعمال بھی کرتے ہیں OBJECTIVE کے لئے ہم خارجی اور معروضی دونوں لاتے ہیں FEELING اور EMOTION کے لیے علیحدہ علیحدہ الفاظ نہیں ہیں نظریہ THEORY کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے اور IDEOLOGY کے لیے بھی۔ امیج اور امیجری کے لیے جس کا جو جی چاہے لفظ استعمال کرتا ہے مجھے اس پر اصرار نہیں کہ اس سلسلے میں عربی فارسی سے اصطلاحیں لی جائیں۔ عربی، فارسی، ہندی، انگریزی جس زبان کا لفظ موزوں ہو استعمال کرنا چاہیے اور اصطلاحات بنانے میں ہندی اور فارسی دونوں اجزا سے کام لینا چاہیے جس طرح انگریزوں نے ٹیلی وژن جیسے لفظ بنائے ہیں ہمیں بھی بنانا چاہیے۔

تنقید کے لیے زبان کا مسئلہ اس لیے اور بھی اہم ہے کہ اب تک ہم زبان کی صحت کے سلسلے میں چلن کے بجائے دہلی اور لکھنؤ کی ٹکسال پر تکیہ کرتے ہیں۔ تحریر کے لیے معیاری زبان کی ضرورت مسلّم مگر معیاری زبان وہ ہے جسے معیاری ادیبوں نے استعمال کیا ہے اگر اس کا لحاظ رکھا جائے تو زبان کا ایک نیا معیار قائم ہو جاتا ہے جس میں نشاط اور نجات کے قافیے کی صحت پر بحث کی گنجائش باقی نہیں رہتی اور زبان کی خود مختار حیثیت اور اس کا چلن معیار بنتا ہے۔

موجودہ اُردو تنقید کا یہ کارنامہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ اس نے مشاعروں کے شاعر کو اپنی مسند سے ہٹا کر دوسری صف میں بٹھا دیا ہے۔ اس کے معنی یہ نہیں کہ مشاعروں میں اچھے شاعر سرے سے مقبول نہیں۔ ہاں اس کے معنی یہ ضرور ہیں کہ مشاعروں کی مقبولیت شاعری کا معیار نہیں ہے کیونکہ یہاں دوسرے عناصر بھی کام کرتے ہیں۔

چنانچہ فیض و فراق مشاعرے کے راستے سے شاعری کی مسند کی طرف نہیں آئے' شاعری کی مسند نے انھیں مشاعرے کی مسند بھی دے دی ہے اور یہی بات اختر الایمان' جمیل مظہری اور احمد ندیم قاسمی کے متعلق بھی کہی جا سکتی ہے۔

اس طرح موجودہ تنقید نے بعض شعرا کو ان کا حقیقی مقام دلایا ہے۔ اس سلسلے میں فانی اور یگانہ کا نام لینا ضروری ہے۔ فانی کی عظمت سے سرے سے انکار تو کسی دور میں ممکن نہ تھا مگر ان کی یاسیت آج سے بیس پچیس برس پہلے کچھ اچھی نظر سے نہ دیکھی جاتی تھی حیات و موت کا جو عرفان فانی کے یہاں ملتا ہے اس کے ساتھ اب زیادہ انصاف ہو رہا ہے اور وہ صرف خواہشِ مرگ کے شاعر نہیں بلکہ اس بے پایاں درد و کرب کے شاعر سمجھے جاتے ہیں جس کا ایک نام زندگی ہے اور دوسرا موت۔ پھر یگانہ کی انفرادیت اور کس بل کا احساس بھی اس دور کی تنقید کی صحتِ نظر کی روشن دلیل ہے اس طرح جو لوگ بیدی کی زبان سے مانوس نہ ہونے کی وجہ سے اُن کے فن کی عظمت کو نہ پہنچ سکتے تھے اور کرشن چندر کی رومانیت اور زبان کی چاشنی کی وجہ سے ان کے ناولوں اور افسانوں کو فن کی معراج سمجھ بیٹھے تھے اور فارمولے کو ادب قرار دینے لگے تھے ان کی کم نگاہی کی طرف اشارہ کر کے ہمارے نقادوں نے صحتِ ذوق کے آداب سکھائے ہیں۔ منٹو کی عظمت کا ابھی پُورا احساس نہیں ہوا اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کی چند جنسی مسائل سے دلچسپی کی وجہ سے اس کی حیرت انگیز فنی صلاحیت اور اس کی جدید اور جاندار زبان کی طرف ابھی لوگوں کی نظر نہیں پڑی ہے۔

ہماری تنقید نے بلاشبہ اس تیس سال میں خاصا قدم آگے بڑھایا ہے لیکن اسے ابھی ایسا جمالیاتی نظریہ مرتب کرنا ہے جس میں ایک طرف روایت کا احساس ہو اور دوسری طرف حسن کاری کے نئے آداب کے سمجھنے اور سمجھانے کی گنجائش۔ جس میں نثر اور نظم کے بنیادی فرق کو ملحوظ رکھا جائے اور دونوں کے حسن کے ساتھ

انصاف ہو سکے اور جس میں شاعری کے نئے احساس کی ترجمانی کے لئے اصول موجود ہوں۔ اس جمالیاتی نظریے کے لیے ادب کو محض فنِ لطیف سمجھنا کافی نہ ہوگا۔ زندگی اور تہذیب سے اس کے بنیادی تعلق کو ملحوظ رکھنا ہوگا۔ یہ نظریہ انتخابی ہوگا کیونکہ زندگی انتخابی ہے۔ اس کی ہندوستانیت مشرقی مزاج کا سہارا لے کر علیحدگی پسندی کی طرف نہ لے جائے گی بلکہ شوق کے ہر صحرا اور عشقِ بلاخیز کے قافلۂ سخت جان کی ہر منزل کو اپنائے گی۔ یہ سائنس سے معروضیت لے گی اور اسے انسان دوستی کی قدریں دے گی۔ یہ ادب کی خاطر تعلیم، تہذیب، سماجیات، نفسیات سب کی وادیوں سے گزرے گی مگر ان میں بھٹکتے رہنے کے بجائے اپنے مرکز کی طرف واپس آئے گی اور بقول ایلیٹ فن اور فن پاروں کی توضیح کے ذریعے سے ذوقِ سلیم کی اشاعت کر کے صنعتی دور میں انسانیت کی قدروں کا علم بلند رکھے گی۔

آپ ہمارے کتابی سلسلے کا حصہ بن سکتے
ہیں مزید اس طرح کی شان دار،
مفید اور نایاب کتب کے حصول کے لئے
ہمارے وٹس ایپ گروپ کو جوائن کریں

ایڈمن پینل

عبداللہ عتیق : 03478848884
سدرہ طاہر : 03340120123
حسنین سیالوی : 03056406067

۱۳

# میرا تنقیدی اور اَدبی نُقطۂ نظر

اب مجھے[1] اپنے عام تنقیدی نقطۂ نظر کے متعلق ... کچھ کہنا ہے۔ ہمارے یہاں سنجیدہ تنقید نگاری اب جا کر شروع ہوئی ہے لیکن اب بھی کچھ لوگ صرف قدیم ادب یا صرف جدید ادب کے پرستار ہیں۔ یہ بات ایک اچھے نقاد کے منصب کے خلاف ہے۔ وہ اپنے آپ کو اس طرح خانوں میں نہیں بانٹ سکتا۔ اس کے لئے تو ضروری ہے کہ وہ سارے ادب پر نظر رکھتا ہو اور اس میں ایک واضح نقطۂ نظر دیکھتا ہو۔ وہ بعض قدیم چیزوں کو اچھا کہہ سکتا ہے اور بعض کو بُرا، مگر وہ سارے قدیم سرمائے کو ٹھکرا نہیں سکتا۔ اسی طرح وہ ہر نئی چیز کو شبہے کی نظر سے نہیں دیکھ سکتا۔ وہ بعض ادبی روایات کی قدر کرتا ہے مگر نئے نئے تجربوں اور نئی نئی علامات سے بہرا کتا نہیں۔ وہ صرف ایک خاص صنفِ سخن غزل ہی سے مانوس نہیں، ہر صنفِ سخن کی مخصوص لَے کو پہچانتا ہے، یہاں تک کہ بے قافیہ نظم کو بھی اس وجہ سے بُرا نہیں کہہ سکتا کہ وہ بے قافیہ ہے۔ وہ جانب دار نہ ہوگا، ایمانداری سے اپنے خیالات کا اظہار کرے گا۔

---

[1] تنقیدی اشارے، ۶۰

اُس کا پہلا کام ترجمانی ہے، پھر انصاف ۔ وہ ہر شاعر اور افسانہ نگار کے آگے بھی رہے گا اور ساتھ بھی۔ وہ محض رنگوں کی ماہیت اور خوشبو کے اجزا کے متعلق گفتگو نہ کرے گا۔ وہ اس رنگ و بو سے آشنا ہونا اور اس کی قدر کرنا سکھائے گا۔ وہ محض تخریب کا قائل نہ ہوگا کوئی تعمیری تصور بھی رکھتا ہوگا۔ وہ تقلید اور اُپج میں خود فرق کر سکے گا اور دوسروں پر یہ فرق واضح کر سکے گا۔ اس کی طبیعت میں سنجیدگی، اُس کے لہجے میں نرمی اور اُس کی بات میں خلوص ہوگا۔ لفاظی، جانبداری، سطحیت، قطعیت کا اس کے ہاں گذر نہ ہوگا۔

(میری تحریروں) میں آپ کو جا بجا انگریزی کے ادیبوں کے مقولے، اُن سے موازنے، اُن کے اشارے، اُن کے حوالے ملیں گے۔ میں اسے بُرا نہیں سمجھتا۔ اُردو نے دوسرے ادبیات کے خزانوں سے بہت کچھ لیا ہے۔ انگریزی ایک زندہ، عالمگیر اور ایک شاندار تاریخی میراث کی مالک زبان کی حیثیت سے ہمیں ابھی بہت کچھ دے سکتی ہے۔ اس سے منہ موڑ کر بیٹھنا اچھا نہیں، ہاں انگریزی ادب کے اصولوں کو اٹل سمجھنا یا صرف اس معیار سے اپنی ہر چیز کو پسند یا ناپسند کرنا صحیح نہیں۔ ادبی اصول عالمگیر بھی ہیں اور مقامی بھی، کسی میں ایک پہلو پر زور دیا گیا ہے، کسی میں دوسرے پر۔ اس وحدت و کثرت سے گھبرانا نہیں چاہیے، اسے سمجھنا چاہیے۔

چند باتیں[1] (مزید) میرے تنقیدی نقطۂ نظر کے متعلق یہاں ناموزوں نہ ہوں گی۔ مَیں اَدب میں پہلے ادبیت دیکھتا ہوں، بعد میں کچھ اور، گویہ جانتا ہوں کہ ادب میں جان، زندگی سے ایک گہرے اور استوار تعلق سے آتی ہے۔ مَیں ادب کا مقصد نہ ذہنی عیاشی سمجھتا ہوں، نہ اشتراکیت کا پرچار۔ مَیں محض نیا یا پُرانا کہلانا پسند نہیں کرتا۔ مَیں نیا بھی ہوں اور پُرانا بھی لیکن قدرتی طور پر اپنے دَور کے میلانات و خیالات سے

---

[1] نئے اور پُرانے چراغ ۷-۹

متاثر ہوں۔ میں مغربی اصولوں، نظریوں اور تجربوں سے مدد لینا اُردو ادب کے لئے مفید سمجھتا ہوں مگر اس کے معنی یہ نہیں لیتا کہ اپنے تہذیبی سرمائے کے قابلِ قدر حصّوں کو نظر انداز کر دوں۔

میں نہ غزل کو نیم وحشیانہ صنفِ شاعری سمجھتا ہوں اور نہ صرف غزل پر ایمان لانے والا ہوں، بلکہ اچھی غزل یا اچھی نظم دونوں کے حُسن کا قائل ہوں۔ میں ادبی اُصولوں کو اٹل نہیں سمجھتا، نہ ادب میں مطلق العنانی یا آمریت کا قائل ہوں۔ میرے نزدیک تجربوں کی ادب میں ہمیشہ ضرورت ہے اور تخلیق، اختراع اور جدت کی ہمیشہ قدر کرنی چاہیے، مگر ہر تجربے پر ایمان نہیں لانا چاہیے۔

میں ترقی پسند تحریک کو ایک مفید، زندہ اور قابلِ قدر تحریک سمجھتا ہوں، مگر میری ترقی پسندی مجھے عریانی، فحاشی، ابہام اور سستے پروپیگنڈے کو ادب کہنے سے روکتی ہے۔ یہ نہیں کہ میں ہر ایک کو خوش رکھنا چاہتا ہوں، یا اِدھر بھی ہوں اور اُدھر بھی۔ یا کوئی قطعی فیصلہ کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ نقاد کا فیصلہ فوجداری عدالت کا فیصلہ نہیں ہے۔ نہ نقاد کی حیثیت ایک ہوشیار وکیل کی ہے۔

رچرڈس نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "ایک اچھے نقاد میں تین خوبیاں ہونی چاہئیں، — اُس کیفیت تک پہنچنا جو مصنف یا تصنیف کی ہے۔ تجربات اور تجربات میں امتیاز کرنا تاکہ اُن کی قدر و قیمت کا اندازہ ہو سکے، قدروں کا نباض ہونا۔" اِسی اصول پر چلنے کی میں نے کوشش کی ہے۔ بعض تنقیدیں بڑی خیال انگیز ہو سکتی ہیں لیکن اُن پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ وہ خاص حالات، دوروں یا طبائع کی اچھی نباض ہوتی ہیں مثلاً یحییٰ بخاری اور عظمت اللہ خاں، کلیم الدین اور سجاد ظہیر خاص چیزوں کے اچھے نقاد ہیں۔ انگریزی ادب میں جانسن یا لیمب پر آپ ہر حال میں اعتماد نہیں کر سکتے۔ اچھا نقاد چیزوں کو پسند کرے یا نہ کرے، اُن کی اچھائی کا اعتراف تو کر سکتا ہے۔

نارمل تنقید بہت مشکل کام ہے۔ اس میں نئی بات کی خاطر یا انوکھی بات کی خاطر، صحیح بات کو قربان نہیں کیا جاتا۔ میں نے محض کتاب میں سے اپنے مطلب کی بات نکالنے کی کوشش نہیں کی۔ ادبی غوطہ خوری کو میں اچھی نظر سے نہیں دیکھتا۔

کچھ لوگ ترقی پسند تنقید، جمالیاتی تنقید، نفسیاتی تنقید، صنعتی یا فنی تنقید کے بھی علمبردار نظر آتے ہیں۔ نقاد کو اس طرح اپنے آپ کو خانوں میں بانٹنا اچھا نہیں۔ ادیب اور نقاد کو پارٹی بند نہ ہونا چاہیے، لیکن ادبی نراج سے بھی بچنا چاہیے۔ ہندوستان میں اب بھی لوگ صرف سفید یا صرف سیاہ، صرف دن یا صرف رات کے قائل ہیں۔ بقول لنگلے مارٹن چیزیں نہ صرف اچھی اور بری ہوتی ہیں بلکہ بیک وقت اچھی اور بری ہو سکتی ہیں، اس لئے ہمیں ابھی اور OBJECTIVE ہونا چاہیے۔

ادیب کی انفرادیت[۱]، اجتماعی ضروریات سے مجروح نہیں ہوتی، اس کے باوجود پھل پھول سکتی ہے۔ اقبال کے الفاظ میں وہ جلوۂ بدمست و خلوت پسند ہے۔ انھوں نے ٹھیک لکھا ہے ؎

خودی میں ڈوبتے ہیں پھر ابھر بھی آتے ہیں
مگر یہ حوصلۂ مردِ ہیچ کارہ نہیں

چنانچہ ادب میں انفرادیت، خارجیت اور عصریت تینوں کا میں قائل ہوں اور تینوں کو ایک دوسرے کی ضد نہیں سمجھتا۔ میں آسمانوں کی کشش کو محسوس کرتا ہوں گو زمین کے حسن کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ میں اپنے دور کے نت نئے انکشافات اور تجربات کو نہیں بھلا سکتا۔ میں اس رزم و بزم، تخریب و تعمیر کے کھیل میں انسانیت کے ارتقا کو برابر دیکھتا ہوں۔

---

[۱] نئے اور پرانے چراغ ۹۰

میں تنقید کو شعر کے پتے کرنا نہیں سمجھتا۔ ادبی شعور میں گہرائی اور تازگی پیدا کرنے کے مترادف سمجھتا ہوں۔ میں تنقید کو کسی طرح تخلیقی ادب سے کم نہیں سمجھتا بلکہ موجودہ (۱۹۴۶) ادبی معیار کی پستی کو دیکھتے ہوئے ایک اچھے تنقیدی معیار اور ایک صحیح ادبی ذوق کی ترویج کو بڑی اہمیت دیتا ہوں۔ ایک اچھے معیار کے فقدان کی وجہ سے ادبی شہرتیں جلد حاصل ہو جاتی ہیں اور جلد کھوئی بھی جاتی ہیں۔ ہر چیز میں انتہا پسندی اور غلو نے اس روش کو اور زیادہ خطرناک بنا دیا ہے۔ اسی لیے معقولیت اور توازن (SANITY AND NORMALITY) کی تلقین ضروری سمجھتا ہوں۔

اُردو تنقید[1] میں سب سے بڑی ضرورت .... خارجیت یا OBJECTIVITY کی ہے .... جب تک آپ کسی چیز کی روح تک نہ پہنچیں، اس کے ساتھ انصاف نہیں کر سکتے۔ اس ہمدردی یا رفاقت کے بعد اس تجربے اور دوسرے بڑے تجربوں کے پرکھنے کا سوال آتا ہے، آخر میں قدریں بنانے اور نافذ کرنے کا۔ میرے یہاں تنقید میں یہی عمل ملے گا۔ اس عمل کو سامنے رکھا جائے تو یہ سمجھ میں آجائے گا کہ میں کیوں تصویر کے دونوں رُخ دیکھنے کی کوشش کرتا ہوں، کیوں بعض اصولوں کو مانتے ہوئے اور بعض بڑے انسانی، سماجی اور اخلاقی مقاصد پر ایمان لاتے ہوئے دوسرے نظریوں کو آنکھ بند کر کے حرفِ غلط نہیں قرار دیتا، بلکہ ان کی اہمیت کو پرکھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ کیوں میرے یہاں ترجمانی کی کوشش اور تجزیے کی فکر اس قدر ہے، کیوں میں دوسرے کو تھوڑی دیر کے لیے زبان اور اپنا قلم دے دیتا ہوں، مگر اس کے ہاتھ میں بالکل کھلونا نہیں بن جاتا، بلکہ خود بھی ذمہ دار ہوتا ہوں۔ یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ میری تنقیدوں میں میری جھلک نہیں ہے، ہاں وہ برنارڈ شا کے دیباچوں کی طرح صرف "میرا اشتہار" نہیں ہیں۔

---

[1] تنقید کیا ہے، ۱۰-۱۱

ادب[1] میری محبت ہے اور ادب کی تدریس صرف میرا مشغلہ ہی نہیں، میری عبادت بھی رہی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ کسی آدمی یا ادارے یا قوم کو پہچاننے کے لئے پہلے اس سے محبت ضروری ہے، میری مراد طفلانہ محبت سے نہیں، یہی محبت عرفان کی منزل تک لے جائے گی اور محبوب کی خوبیوں اور خامیوں دونوں سے آگاہ کرے گی۔ یہ زندگی کو اس کے ہر رنگ میں دیکھے گی اور دکھائے گی اور اپنی تنظیم اور خیال انگیزی کی وجہ سے زندگی کی نئی تنظیم کی طرف مائل کرے گی۔ اگر ہم اپنے پورے شعری سرمائے پر نظر ڈالیں تو اس کے رنگا رنگ حسن، اس کی گہرائی اور گیرائی اور اس کے بدلتے رہنے کے باوجود اپنے منصب سے وفادار رہنے کا احساس ہو جائے گا اور یہ احساس ہمیشہ مسرت بھی دے گا اور بصیرت بھی۔

میں[2] نے اپنے ادبی نقطۂ نظر کو..... وضاحت سے بیان کر دیا ہے۔ یہاں.... صرف[3] یہ کہنا کافی سمجھتا ہوں کہ میں تنقید کو ایک سنجیدہ، اہم اور مشکل کام سمجھتا ہوں اور اس کا مقصد لطفِ سخن ہی نہیں بلکہ قدروں کی اشاعت جانتا ہوں، اس لیے پڑھنے والوں سے بھی سنجیدگی اور متانت اور غور و فکر کا مطالبہ کرتا ہوں۔

ایک[4] بات مجھے اپنے اسلوب کے متعلق کہنی ہے۔ تنقیدی ادب[5] میں اصطلاحوں کے استعمال کے بغیر کام نہیں چلتا۔ تنقید کی زبان عوام کی زبان نہیں ہو سکتی۔ لیکن میں چونکہ تنقید کو ذہنی عیاشی نہیں سمجھتا، بلکہ انسانی ذہن کے لئے اس کا وہی کام سمجھتا ہوں جو ایک مریض کے لیے ڈاکٹر کرتا ہے، اس لیے میں عام فہم اندازِ بیان کی کوشش کرتا ہوں، گو اس میں ہر جگہ کامیابی نہیں ہوئی۔

میں[6] نے اپنے مضامین میں جا بجا شاعرانہ اندازِ بیان یا جذباتی اسلوب کے خلاف

---

[1] مسرت سے بصیرت تک، ۹ [2] تنقید کیا ہے، ۱۱ [3] تنقید کیا ہے، ۱۲
[4] تنقید کیا ہے، ۱۲ [5] نئے اور پرانے چراغ، ۱۰ [6] تنقید کیا ہے، ۱۲، ۱۳

آواز بلند کی ہے۔ میرے یہاں آپ کو اشعار کی کثرت یا اقتباسات کی بھرمار نہ ملے گی لیکن اشعار کے حوالوں، کتابوں کے نام، ادبی شخصیتوں کے تذکرے، ادبی تحریکوں کے متعلق اشاروں سے آپ کو تنقید کے وزن کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ شاعروں کے تذکرے میں مثالیں ناگزیر ہیں۔ مگر مثالوں کے باوجود مضمون کو اشعار کی طرح نہیں ہونا چاہیے۔ میں حوالوں کے خلاف نہیں، مسل بندی اور واقعات کی کھتونی کے خلاف ہوں۔ میں جذباتیت کے بھی خلاف ہوں، مگر جذبے کے خلاف نہیں ہوں۔ جذبے کی تہذیب کو میں بہت کچھ سمجھتا ہوں۔ مجھے وہ نثر بھلی معلوم ہوتی ہے جس میں خیال آئینے کی طرح واضح ہے جس میں علمیت کا رعب ڈالنا مقصود نہیں، علمیت کی گہرائی اور گیرائی ہے۔

اُردو میں خطیبانہ، شاعرانہ یا رنگین نثر تو بہت مل جاتی ہے، مگر اچھی اور دلکش اور شگفتہ نثر کم ہے۔ نثر تعبیری اظہار ہے اور شعر تخلیقی۔ نثر میں خیال کا آہنگ ہوتا ہے، شعر میں جذبے کا۔ نثر میں معلومات کو گوارا بنانا ہوتا ہے، شعر میں کیفیات کو، دونوں میں ایک رشتہ ہے مگر دونوں کا دائرہ علیحدہ علیحدہ ہے۔ نثر کا کمال یہ ہے کہ یہاں عشق، "عقلِ خداداد" کی پیروی کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ اُردو میں اس نکتے کو بڑی دیر میں سمجھا گیا ہے اور یہ سمجھ بھی عام نہیں ہے۔

(تنقید[1]) ادبی اسالیب کو نظر انداز نہیں کر سکتی۔ ایسی تنقید سے کیا فائدہ جسے پڑھ کر سر میں درد ہونے لگے جو اپنی زبان و ادب کے رنگ و آہنگ سے بیگانہ ہو، جس میں خیالات کی لطیف پھوار نہ ہو بلکہ گولہ باری ہو۔ ادبی تنقید محض علمی صحیفہ نہیں ہے، علم کا عطر ہے۔ اس سلسلے میں ہم انگریزی تنقید کے عام معیار سے اور فائدہ اُٹھا سکتے ہیں جو غذائیت بھی رکھتی ہے اور زود ہضم بھی ہے مگر انگریزی تنقید سے فائدہ اٹھانے

---

[1] ادب اور نظریہ، ۸

کے لیے دانائے راز اور محرم اسرار ہونا بھی ضروری ہے، اندھی تقلید تو اور مضر ہوگی۔

بعض لوگوں[1] کا خیال ہے کہ میرے مضامین سے پورا پورا لطف اٹھانے کے لئے اردو ادب کے علاوہ انگریزی ادب کا علم بھی ضروری ہے۔ معلوم نہیں اسے خوبی سمجھا گیا ہے یا خامی — مجھے یہ کہنے میں شرم نہیں آتی کہ میں نے انگریزی ادب کے مطالعے سے بہت کچھ حاصل کیا ہے، مگر میں نے کبھی اردو تنقید کو انگریزی کی نقالی نہیں سمجھا۔ کوئی خود مختار اور مستقل زبان، دوسرے ادب کی نقالی کر کے زندہ نہیں رہ سکتی۔

میں اپنی نسل کے لئے لکھتا ہوں اور اتفاق سے یہ نسل اردو ادب کے علاوہ انگریزی ادب سے بھی کچھ نہ کچھ واقف ہے، لیکن میں نے کبھی اپنے قدیم سرمائے کی اہمیت یا عربی، فارسی، سنسکرت کے مزاج کی اہمیت سے انکار نہیں کیا۔ اپنی روایات سے انکار، اپنے آپ سے انکار ہے — مگر روایات کی خاطر موجودہ دور کے رجحانات، مسائل، تجربات اور امکانات سے بیگانہ رہنا ہٹ دھرمی ہوگا، بلکہ ان سے ہمدردی ضروری ہے۔

نئے اور پرانے کی آویزش ہمارے ادب میں اب تک جاری ہے۔۔۔۔ بعض اوقات نازک اور فیصلہ کن لمحوں میں انسان کو ادھر اُدھر ہونا پڑتا ہے مگر ایک خیال یا نظریے سے ہمدردی رکھتے ہوئے بھی نقاد اور ادیب کو آفاقی ہونا چاہیے، صحیح ترقی پسندی یہی ہے اور اقبال نے بھی یہی کہا ہے ؎

زمانہ ایک، حیات ایک، کائنات بھی ایک
دلیلِ کم نظری قصۂ جدید و قدیم

اس[2] میں شک نہیں کہ ہماری تنقید ہی میں نہیں بلکہ ادب کے دوسرے اصناف میں بھی، آج جو اہم اور قابلِ قدر رجحانات ہیں وہ مغرب کے اثر سے آئے ہیں، مگر

---

[1] تنقید کیا ہے؟ ۱۳-۱۴ [2] ادب اور نظریہ، ۶-۷

ہمارے لیے یہ اسی وقت مفید ہو سکتے ہیں جب وہ ہمارے رنگ میں ڈھل کر آئیں اور ہماری اپنی تاریخ کے احساس کے ساتھ پیش کیے جائیں۔ اس وجہ سے میں نے اپنی تنقیدوں میں مشرقی ماحول کے ساتھ ساتھ عالمی معیاروں کو بھی ملحوظ رکھنے کی کوشش کی ہے۔ میری تنقیدوں کے متعلق مختلف رائیں ظاہر کی گئی ہیں مگر مجھے اتنا نظر آتا ہے کہ ان کا اثر ہوا ہے اور ان کا حوالہ اکثر دیا جاتا ہے۔

اپنے شعر و ادب[1] میں مجھے غالب کی عظمتِ فکر، اقبال کی ہمہ گیری اور حالی اور پریم چند کی انسان دوستی نے بڑا متاثر کیا ہے .... ادب میں ذہنی قلعہ بندیوں کا میں قائل نہیں ہوں ..... مجھے مغربی ادب کے مطالعے سے بڑا فائدہ ہوا ہے اور بعض تاریخی اور نفسیاتی حقائق سے بھی بڑی مدد ملی ہے۔

اپنے ایک[2] ڈرامے کے دیباچے میں برنارڈ شا نے اپنی کتاب پر خود دیباچہ لکھنے کی وجہ بیان کی — وہ کہتا ہے: "میں اپنی تعریف کے لئے دوسرا آدمی کیوں لاؤں، جب میں خود اپنی تعریف کر سکتا ہوں۔" آگے چل کر وہ کہتا: "مجھے نہ اپنی مخلوق سے شرمندگی ہے، نہ اس عمل سے جس سے وہ وجود میں آئیں۔" میرا تجربہ شا سے مختلف ہے۔

میں اپنی مخلوقات سے مطمئن نہیں ہوں، اگرچہ ان کے لکھنے میں مجھے لطف آیا، اور لکھنے کے بعد خوشی بھی ہوئی، جو تخلیق کا انعام ہے — مگر اس کے ساتھ ایک شکست کا احساس بھی ہوا ہے۔ کسی ادبی شعور کو جذب کر لینا یا اس میں جذب ہو جانا آسان نہیں ہے، اس میں ہر دفعہ مرنا اور ہر بار زندہ ہونا پڑتا ہے۔ اس میں شخصیت کے ایک حصے کو، دوسرے حصے پر حاکم کرنا ہوتا ہے، جس میں ہر دفعہ کامیابی نہیں ہوئی، ہو بھی نہیں سکتی۔

---

[1] نئے اور پرانے چراغ، ۱۰ [2] تنقید کیا ہے، ۱۱۰

(۱۹۴۲ء ۱۹۴۹ء تک کے سات برس کے) عرصے[۱] میں میرا ادبی نقطۂ نظر بہت کچھ بدلا ہے، لیکن[۲] میں اپنا نقطۂ نظر منوانے کے بجائے ادب میں سنجیدہ علمی اور ماضی و حال دونوں سے آگاہ شعور کا مطالبہ کرتا ہوں، ہمیں آج ذہنی توازن کی سب سے زیادہ ضرورت ہے تاکہ ہم اپنی تہذیبی دولت کے صحیح وارث ثابت ہو سکیں اور اس دولت میں خود بھی اضافہ کر سکیں۔

عمر کے ساتھ انسان کا مزاج بھی بدلتا ہے۔ وہ کچھ سے کچھ ہوتا رہتا ہے۔ میں بھی (ان برسوں) میں بہت کچھ بدلا ہوں۔ بعض رنگ اب ہلکے ہو گئے ہیں، بعض گہرے: بعض رائیں بدل گئی ہیں، بعض پر اور سختی سے جم گیا ہوں۔ بحیثیتِ مجموعی میرے یہاں ایک خاموش تبدیلی ہوئی ہے — میں مزاج کے اعتبار سے مشرقی ہوں اور ذہن کے اعتبار سے مغربی۔ یہ بات شاید آپ کو بے تکی معلوم ہو، لیکن اقبالؔ بھی دراصل یہی تھے —

---

[۱] تنقیدی اشارے، ۸ [۲] تنقیدی اشارے، ۹ [۳] نئے اور پرانے چراغ، ۱۰

rekhta

(۱۴)

---

بطور نقاد کچھ سوال اور میرے جواب

## تنقید نگاری سے (میرا) مقصد ادب کی تاریخ کو مُرتب کرنا ہے یا ہم عصر ادب پر اثر انداز ہونا۔؟ *

تنقید نگاری[1] سے میرا مقصد ادب کی تاریخ متعین کرنا نہیں ہے اور ہم عصر ادب پر اثر انداز ہونا بھی براہِ راست میرا مقصد نہیں۔ ہاں ہم عصر ادب کو سمجھنا اور سمجھانا میرا مقصد ضرور ہے۔ سمجھنے سمجھانے کا اثر ہوتا ہے اور میرے خیال میں ہوا بھی ہے۔

تنقید کا بنیادی فریضہ اپنے دور میں ذوقِ سلیم کو عام کرنا ہے۔ اس غرض سے ماضی کے ادب کا مطالعہ کیا جاتا ہے کہ اس سے ہمیں معیاری نمونوں، پیمانوں اور معنی خیز اصولوں کا احساس ہوتا ہے جن کے سہارے حال کی تخلیق کے جنگل میں اقدار کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ مگر ماضی کے ادب کا جائزہ لینا ہی نقاد کا کام نہیں۔ یہ ایک علیحدہ کام ہے اور ادبی مؤرخ کا کام ہے ادبی مورخ کے لئے ماضی کے ادب کو جدید ترین تحقیق کے مطابق

---

* سوال ادبِ لطیف کے مدیر انتظار حسین کے اور جواب آلِ احمد سرور کے۔

[1] ادبِ لطیف، لاہور، جنوری ۱۹۶۴ء، ص ۵

دوروں، میلانوں، تحریکوں، روایات و تجربات کے سلسلے کے طور پر دیکھنا سب کچھ ہے۔ نقاد کا کام دوسرا ہے۔ ماضی کا ادب اور اس کا جائزہ اس کی مدد کرتا ہے، مگر یہ حال کے ادب کی تفسیر و ترجمانی اور پرکھ میں کام آتا ہے۔ میں اِس لیے تنقید نہیں لکھتا کہ اس کے ذریعے سے مجھے ماضی کا تجزیہ کرنا ہے بلکہ ماضی کے تجزیے کو حال کی سمجھ بوجھ کے لیے استعمال کرتا ہے تاکہ اہم روایات کا احساس رہے مگر روایات کی غلامی نہ ہو، تجربات کی گنجائش ہو مگر تجربات کی خاطر اپنی بنیادوں سے بے پروا ہی بھی نہ ہو۔ میں مُردہ پرست نہیں ہوں ہاں مُردوں سے واقفیت اِس لیے ضروری سمجھتا ہوں کہ زندوں کے کام آسکوں۔

"کیا (میری) دانست میں (میری) تنقید سے ہم عصر ادب کو کوئی فائدہ پہنچا ہے؟ اور کیا ہم عصر لکھنے والوں نے کسی طور پر (میری) تنقیدی فکر سے اثر قبول کیا ہے؟"

اس کا فیصلہ[1] کرنا میرا کام نہیں کہ میری تنقید سے ہمعصر ادب کو کیا فائدہ پہنچا ہے۔ ہاں یہ دیکھتا ہوں کہ برسوں سے میرے مضامین کا حوالہ دیا جاتا رہا ہے اور میری تنقیدوں کے جُملے اپنے دعوے کے ثبوت میں مضمون نگاروں نے پیش کیے ہیں ـــــ اگر کوئی اس کا جائزہ لے کہ کن چند تنقید نگاروں کو اکثر کوٹ کیا جاتا ہے تو اس فہرست میں میرا نام بھی غالباً ہو گا۔ میرا یہ بھی خیال ہے کہ ظرف داروں کے اس دور میں میری تنقیدوں سے "سخن فہمی" بڑھی ہے گو ظرف داروں نے قدرتی طور پر مجھے نظر انداز کرنے کی کوشش کی ہے۔ میرا یہ کارنامہ غالباً قابلِ ذکر سمجھا جائے کہ ترقی پسند تحریک میں مَیں نے توازن پیدا کیا اور جب ردِ عمل کے طور پر "عیب" کا تذکرہ شروع ہوا تو میں نے اس کے "ہنر" بھی بیان کرنا

---

[1] ادبِ لطیف، لاہور، جنوری ۱۹۶۴ء، ص ۶

ضروری سمجھا۔ پہلی چیز کا احساس تو بہت سے لکھنے والوں کو ہے، دوسری چیز کا احساس ابھی نہیں ہو پایا ہے۔

"(میں) گزشتہ ادب کے بارے میں کیوں لکھتا ہوں؟"

اس[1] کا جواب ایک حد تک پہلے سوال کے جواب میں آ چکا ہے۔ ہر تعمیر کے لئے بنیاد کا علم ضروری ہے۔ اس کے علاوہ اگر قوم کی اپنی تاریخ سے دلچسپی فطری ہے تو ادیب کی اپنے ماضی کے معماروں سے دلچسپی بھی قدرتی ہے۔ پھر اس کے علاوہ ایک بات اور بھی ہے ماضی کے بارے میں ہم زیادہ غیر جانبداری سے لکھ سکتے ہیں۔ ضروری معلومات حاصل کرنے کے بعد ہمارا کام یہ ہوتا ہے کہ ہم اسے مناسب ترتیب کے ساتھ پیش کر دیں۔ حال کا تجزیہ نسبتاً مشکل ہے کیونکہ اس میں اتنی بے تعلقی اور غیر جانبداری پیدا کرنا آسان نہیں۔

ایک ضمنی بات یہ بھی ہے کہ ماضی کے ادب کے بارے میں درس و تدریس کے سلسلے میں کچھ لکھنا پڑتا ہے۔ میرا تجربہ یہ ہے کہ دوسرے کو سمجھانے سے پہلے اپنے کو بات سمجھانی ہوتی ہے۔ اس کا بہترین طریقہ اس بات کو لکھنا ہے۔ دوسروں کو سمجھنے اور سمجھانے کے راستے سے اپنے کو سمجھنے میں بھی مدد ملتی ہے۔

"ہم عصروں پر لکھنے میں کبھی جھجک محسوس ہوئی؟ ہوئی ہے تو کیوں؟"

ہم عصروں[2] پر لکھنے میں جھجک محسوس نہیں ہوتی۔ یہ ایک مزاج کا سوال ہے۔ چونکہ ہم عصروں کا پورا کارنامہ ایک دفعہ سامنے نہیں آتا اور ان کے یہاں تبدیلیاں بھی ہوتی رہتی ہیں۔ اس لیے ان پر لکھنے میں یہ محسوس ہوتا ہے کہ بات (عارضی) ہے۔ ہمارے

---

[1] ادب لطیف، لاہور، جنوری ۱۹۶۴ء، ص ۶ [2] ادب لطیف، لاہور، جنوری ۱۹۶۴ء، ص ۶

یہاں لوگ ابھی نکتہ چینی کے عادی نہیں ہیں۔ وہ تعریف سُننا چاہتے ہیں۔ اس لئے بعض اوقات لوگ مشروط تعریف سے ناراض ہوتے ہیں اور پھر غلط فہمی پھیلاتے ہیں۔ یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک شاعر یا افسانہ نگار کی تعریف کی جائے تو دوسرا ناراض ہو جاتا ہے اور لکھنے والے پر لیبل لگا دیا جاتا ہے۔ اس لیے جھجک کے بجائے احتیاط کا لفظ زیادہ موزوں ہوگا۔ میں اس احتیاط کو اچھا سمجھتا ہوں۔ اس کی وجہ سے رائے میں پختگی آتی ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں لینے چاہئیں کہ میں کوئی حجاب یا جھجک محسوس کرتا ہوں۔

"اگر تقسیم کے بعد اردو تنقید نہ لکھی جاتی تو اس سے ہمارے ادب کی تاریخ میں کیا فرق پڑتا؟"

یہ سوال[1] عجیب ہے۔ تقسیم سے پہلے جس طرح تنقید نہ لکھنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا تھا، اس طرح تقسیم کے بعد بھی نہیں ہوتا۔ ہر دور میں تنقید لکھی جاتی رہی ہے اور یہ مجبوں طور پر درست بھی ہے۔ تنقید اس لیے لکھی جاتی ہے کہ لوگ ادب کو سمجھنا چاہتے ہیں تاکہ اس طرح زندگی کی معرفت بڑھے۔ تقسیم کے بعد بہت سے میلانات اُبھرے ہیں اُن کی اہمیت متعین کرنا اُن میں سے سطحی اور معنی خیز میلانات کو الگ الگ کرنا، وقتی کارناموں اور مستقل اہمیت رکھنے والے کارناموں میں فرق کرنا، کسی جذباتی لے کی حقیقت واضح کرنا، کسی نعرے کا کھوکھلا پن ظاہر کرنا، کسی پراسرار چہرے سے نقاب اُتارنا، کسی دیوتا کے مٹی کے پاؤں دیکھنا، کسی تجربے کی اہمیت کی طرف توجہ دلانا، کسی کوتاہی یا کمی کی طرف اشارہ کرنا، یہ سب تنقید کا کام ہے۔ یہ کام بُرا بھلا ہوتا رہا ہے۔ یہ نہ ہوتا

---

[1] ادب لطیف، لاہور، جنوری ۱۹۶۴ء، ص ۶-۷

تو ایک کمی رہ جاتی۔ یعنی پیمانے کو وار سمجھنے، ہر جدید کو لذیذ سمجھنے یا ماضی کے ہر سائے کی پرستش کرنے اور ہر کھنڈر میں عظمت و عبرت ڈھونڈھنے کا مرض زیادہ عام ہوتا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ تقسیم کے بعد تنقید میں لہجے کی جو تبدیلی ہوئی ہے وہ اچھی نہیں یہ زیادہ شخصی اور ذاتی ہوگئی ہے اس میں منفیانہ مزاج ضرور آگیا ہے۔ اسے کچھ لوگوں نے فقرے بازی یا پگڑی اُچھالنے کے لیے بھی استعمال کیا ہے۔ ادب کی تاریخ پر اس دھول دھپے کا بھی اثر پڑتا ہے مگر میکدے کے پرستاروں کو دھول دھپے پر بہت زیادہ ناک بھوں بھی نہیں چڑھانی چاہیے۔ کچھ لوگوں کی بدمستیوں کے باوجود مستی کے آداب مسلّم ہیں۔ مجموعی طور پر تقسیم کے بعد کی تنقید میں گہرائی زیادہ ہے اس میں ہیرو پرستی کم ہے اس لیے اس تنقید نے ادب کی تاریخ کو جامعیت عطا ضرور کی ہے۔

"کیا ہمارے ادب نے تقسیم کے بعد زوال کیا ہے؟ اگر (ہاں) ایسا سمجھتا ہوں تو زوال کے اس عمل میں، میں اپنی تنقید نگاری کا مقام کیسے متعین کروں گا؟"

"میں[1] یہ ماننے کو تیار نہیں ہوں کہ تقسیم کے بعد ہمارے ادب پر زوال آگیا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہوا کہ تقسیم کے بعد کچھ عرصے تک چند وقتی رجحانات نے اپنا زور دکھایا اور اس زمانے کے ادب میں مجموعی طور پر ادبی انداز کم اور تبلیغی انداز زیادہ تھا۔ یہ حالت سات آٹھ سال تک رہی، اس کے بعد حالات کے نارمل ہونے پر ادبی کاوشیں محض جذباتی یا وقتی نہ رہیں ان ابتدائی سات آٹھ سالوں میں تحقیق پر بہت زور رہا جو نسبتاً

---

[1] ادب لطیف، لاہور، جنوری ۱۹۶۴ء، ص ۷

آسان کام ہے اور تنقید میں بھی افراط و تفریط رہی ہے اور ایک حد تک یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے۔ مگر جہاں تک میں دیکھ سکا ہوں اس کے بعد سنجیدہ تنقید پھر سامنے آنے لگی ہے۔ اس تنقید میں تحقیق سے زیادہ مدد لی گئی ہے اور ایک حد تک یہ ضروری تھا مگر اس میں شخصی اور ذاتی نقطۂ نظر اب بھی میرے نزدیک زیادہ ہے۔ اس کا لہجہ بھی اتنا متوازن نہیں ہے جتنا میں چاہتا ہوں۔ پھر بھی مجھے بھروسہ ہے کہ یہ توازن آتے آتے آئے گا۔ اور لوگ تنقید کو تلوار یا ڈھال کی طرح استعمال کرنے کے بجائے پارکھ یا مبصر کی طرح استعمال کرنے کی عادت ڈال لیں گے۔ رہا یہ سوال کہ زوال کے اس عمل میں میری تنقید نگاری کا مقام کیا ہے تو مجھے اس سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے اور اس کا فیصلہ میرا نہیں دوسروں کا کام ہے۔ میں یہ جانتا ہوں کہ اشتہار بازی کے دور میں اپنے متعلق دعوے اگرچہ خام ذہنوں کو متاثر اور مرعوب کر سکتے ہیں مگر بالآخر ادب میں انصاف ضرور ہوتا ہے۔ یوں بھی میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو کسی تنقیدی مضمون میں اپنا نام نہ دیکھ کر مضمون نگار کے خلاف ہو جاؤں یا کوئی میری بہت تعریف کرے تو اس کے معیار کو سرے سے نظر انداز کر دوں۔ ہاں اپنی تعریف سے خوش ہر ایک ہوتا ہے اور جو کہتا ہے کہ وہ نہیں ہوتا وہ میرے خیال میں سچ نہیں کہتا۔

اس سلسلے میں ایک بات اور کہہ دوں۔ کسی تنقید نگار کا مقام چند سالوں میں متعین نہیں ہوتا۔ یہ اُس کے پورے کام کو دیکھ کر متعین کیا جاتا ہے۔ ایک اچھی نظم، ایک اچھے تنقیدی مضمون، ایک اچھے ڈرامے کی ہم تعریف کریں گے مگر اچھا شاعر، اچھا نقاد، اچھا ڈرامہ نویس ہم اسے کہیں گے جس نے خاصی تعداد میں قابلِ تعریف چیزیں لکھی ہوں اور جب وہ بعد میں کوئی کمزور چیز لکھے گا تو ہم اس کا نام نقادوں یا شاعروں یا ڈرامہ نگاروں کی فہرست میں سے کاٹ نہیں دیں گے۔ ادیبوں اور شاعروں کی فہرستیں نام دیر میں لکھے جاتے ہیں اور جب لکھ لیے جائیں تو جلد کاٹے نہیں جا سکتے۔

"(میں) ادب کو قاری کی حیثیت سے پڑھتا ہوں یا نقاد کی حیثیت سے؟"

مجھ[1] میں اور عام قاری میں فرق یہ ہے کہ عام قاری ہر وقت مرتب ذہن، ذوقِ سلیم تناسب، زندگی اور ادب کے تسلسل، روایات و تجربات کے رشتے، تقابلی پہلو، سب ذہن میں نہیں رکھتا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ ادب میں اپنی پسند ڈھونڈتا ہو، ہو سکتا ہے کہ وہ کسی تجربے یا واقعے سے مشابہت کی وجہ سے اُس ادبی کاوش کو پسند کرتا ہو، ہو سکتا ہے کہ وہ نعروں سے متاثر ہوتا ہو، ہو سکتا ہے کہ وہ زندگی کو کسی آئیڈیالوجی پر منطبق کرنے کا عادی ہو چکا ہو، ہو سکتا ہے کہ وہ ادب میں لذت ڈھونڈھتا ہو، ہو سکتا ہے وہ ایک خاص اخلاق کا قائل ہو، ہو سکتا ہے کہ اُس کا مطالعہ چند مشہور ناقدوں تک محدود ہو، ہو سکتا ہے وہ چند لوگوں کی رائے سے متاثر ہو جاتا ہو۔ اس لیے میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں نے برسوں کے ریاض کے بعد مطالعے کے لیے ایک نظر پیدا کر لی ہے۔ گو مجھے اس کا احساس ہے کہ عام قاری میرے اندر سے غائب نہیں ہو گیا۔ ہاں میں نے ہمیشہ اس مشہور قول کو ذہن میں رکھا ہے کہ کوئی فن پارہ مجھے پسند تو نہ آئے مگر پھر بھی اچھا ہو۔ خلاصہ یہ ہے کہ میرا مطالعہ مجموعی طور پر ایک عام قاری کی طرح کا نہیں ہوتا، ایک ایسے پڑھنے والے کا ہوتا ہے جو ادب کا ایک معیاری تصور رکھتا ہے اور جس کے تصور میں جامعیت بھی ہے۔ میرے خیال میں یہی ایک نقاد کا تصور ہونا چاہیے۔ ہاں میں صرف خوبیوں یا خامیوں کو نہیں دیکھتا، مجموعی طور پر ایک فیصلہ ضرور کرتا ہوں۔

"تنقید لکھتے (میرا) مخاطب ادب کا قاری ہوتا ہے یا ادب؟"

اگرچہ[2] میں ادب کو عام قاری کی حیثیت سے نہیں پڑھتا کیونکہ اب پڑھ نہیں سکتا مگر تنقید

---

[1] ادبِ لطیف، لاہور، جنوری ۱۹۶۴ء، ص ۷-۸ [2] ادبِ لطیف، لاہور، جنوری ۱۹۶۴ء، ص ۸

لکھتے وقت میرے مخاطب ادیب کم ہوتے ہیں عام قاری زیادہ ۔ ادیبوں کا میں زیادہ بھلا نہیں کر سکتا ہوں ہاں قاری میں ذوقِ سلیم پیدا کر سکتا ہوں جس سے بالآخر ادیب کو بھی فائدہ پہنچتا ہے ۔ میں یہ بات تسلیم نہیں کرتا کہ نقاد ادیب پر فیصلہ کن طور سے اثر انداز ہوتا ہے ۔ کوئی ادیب ایک تخریبی تنقید کی وجہ سے اپنا راستہ نہیں بدلتا ۔ بدل بھی نہیں سکتا ۔ زیادہ تر ادیب تنقید کی طرف دھیان نہیں دیتے وہ صرف تعریف چاہتے ہیں ۔ ایک نقاد کسی افسانہ نگار کو ناول نگار نہیں بنا سکتا ۔ ایک غزل گو کو اچھی نظم لکھنا نہیں سکھا سکتا ۔ ہاں وہ غزل گو کو بہتر غزل گو، افسانہ نگار کو بہتر افسانہ نگار بنا سکتا ہے ۔ مگر یہ عمل بھی براہِ راست نہیں ہوتا ۔ پڑھنے والوں کے واسطے سے ہوتا ہے ۔ میں ادیبوں سے اس حد تک سروکار رکھتا ہوں کہ وہ کیا لکھ رہے ہیں اور کیسا لکھ رہے ہیں ۔ ان سے یہ نہیں کہتا کہ وہ باغ میں کیوں چہل قدمی کر رہے ہیں، ڈنڈ کیوں نہیں پیلتے ؟ نہ یہ کہتا ہوں کہ وہ رات کو دیر تک کیوں جاگتے ہیں اور انھیں سورج سے چاندنی کیوں زیادہ پسند ہے ۔ ہاں قاری چونکہ مجھ سے یہ توقع کرتا ہے کہ میں اُسے ایمانداری سے ادب اور زندگی کے آئین بتلاؤں اور معیاروں اور میلانوں سے آگاہ کروں، اِسی لیے میں اس کی توقع کو پورا کرنا چاہتا ہوں ۔ ضمناً اس سے ادیب کو بھی فائدہ پہنچ جائے تو مجھے خوشی ہوتی ہے ۔ میں نے دیکھا ہے کہ ادیب سے براہِ راست بات مفید نہیں ہوتی ۔ یہ بات کسی اور سے ہو رہی ہو تو وہ ضرور غور سے سُنتا ہے اور اس سے فائدہ بھی اُٹھاتا ہے ۔

"کیا (میں نے) شعر یا افسانہ بھی لکھا ہے ؟ اِس کام کو چھوڑ کر تنقید لکھنے میں کیا مصلحت جانی ؟"

میں نے شروع میں دو یا تین افسانے لکھے ۔ ایک رسالہ "تسنیم" آگرہ میں شائع ہوا

---

[1] ادبِ لطیف، لاہور، جنوری ۱۹۶۳ء، ص ۸-۹

نہ معلوم کیوں اُس کے ایڈیٹر ماتی جانسی کو بہت پسند آیا تھا۔ کچھ انگریزی افسانوں کے ترجمے بھی کیے۔ مگر شعر میں بچپن سے کہتا ہوں۔ شعر کہنا میں نے کبھی نہیں چھوڑا ہاں یہ ضرور ہوا کہ کسی زمانے میں شعر کہنے کی رفتار تیز رہی کسی زمانے میں سست۔ ہاں شاعری میری پہلی محبت رہی۔ ۱۹۳۵ء میں نظموں اور غزلوں کا ایک مجموعہ "سلسبیل" شائع ہوا۔ نیاز اور پطرس جیسے مختلف مزاج رکھنے والوں نے خاصا سراہا۔ مگر کچھ عرصے کے بعد مجھے یہ محسوس ہوا کہ شاعری بڑی حاسد محبوبہ ہے۔ یہ مجھے کسی اور کام کے لائق نہ رکھے گی۔ یہ بھی ایمانداری سے سوچا کہ شاید نثر خصوصاً تنقید کے لیے میری طبیعت زیادہ مناسبت رکھتی ہے میرے تنقیدی مضامین بہت جلد مقبول ہو گئے اور مولوی عبدالحق جیسے صاحب نظر نے "تنقیدی اشارے" کی بڑے پُرجوش الفاظ میں تعریف کی۔ اس کے بعد سے تنقید پر زیادہ توجہ رہی۔ شاعری کبھی کبھار کی چیز ہو گئی۔ ایسا نہیں ہے کہ شاعری میں عجز نے مجھے تنقید کی طرف مائل کیا ہو۔ ہاں شاعری بھی مجھے ذہنی طور پر آسودہ نہ کر سکی۔ نقاد کی حیثیت سے میں تخلیق کے درد و کرب سے واقف ہوں۔ میں تنقید کے لیے تخلیقی صلاحیت مفید سمجھتا ہوں، لازمی نہیں سمجھتا، ہاں یہ جانتا ہوں کہ چوٹی کے نقادوں میں ایسے لوگ بھی ہیں جو اعلیٰ تخلیقی صلاحیت رکھتے تھے مثلاً کولرج یا حالی اور ایسے بھی جو تخلیق میں ممتاز نہ تھے مثلاً جانسن یا عبدالحق۔

ایک عجیب اتفاق یہ بھی ہوا کہ لکھنؤ کے قیام کے زمانہ میں ایک زمانہ ایسا گزرا جب میں نے زیادہ تر شاعری کی۔ مگر اس زمانے میں بھی تنقیدی مضامین لکھتا رہا۔ "ذوقِ جنوں" جو ۱۹۵۵ء میں شائع ہوا اسی دورِ جنوں کی یادگار ہے۔ اُس کے بعد علی گڑھ میں شاعری کے لیے یکسوئی نہ ملی۔ یہاں بہت سے کاموں میں گھِر گیا جو تدریسی اور تعلیمی ہونے کے علاوہ انتظامی بھی تھے۔ شعر میں نے اس زمانے میں بھی کہے۔ اس لیے میں تو در اصل اس شعر پر عامل ہوں ؎

در کفے جامِ شریعت در کفے سندانِ عشق
ہر ہوسناکے نداند جام و سنداں باختن

"(میری) تحریروں میں مغربی ادب کے حوالے کثرت سے کیوں آتے ہیں؟"

میری[1] تحریروں میں مغربی ادب کے حوالے کثرت سے اس لیے آتے ہیں کہ میں نے انگریزی ادب کا خاصا مطالعہ کیا ہے اور اس سے متاثر بھی ہوا ہوں۔ میں تو یہاں تک کہنے کے لیے تیار ہوں کہ میں نے ادب کا شعور اور زندگی کا شعور زیادہ تر مغرب سے سیکھا۔ ہاں اس شعور نے میرے اندر ایک نئی مشرقیت کو پیدا کیا جو مغرب سے متاثر ہوتے ہوئے مغرب زدہ نہیں ہے۔ میں اپنی بنیادوں، اپنی تاریخ، اپنے ماحول کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ مغرب نے جو علم و حکمت کا سرمایہ انسانیت کو عطا کیا ہے اُسے بھی اپنا مال سمجھتا ہوں اور اسے اپنے طور پہ کام میں لاتا ہوں۔ میں ہر میکدے سے اپنا ساغر بھرنے اور ہر گھاٹ سے سیراب ہونے کو اپنا فریضہ سمجھتا ہوں۔ میرے نزدیک انسانیت کے ارتقا میں ایشیا کا عطیہ زیادہ تر قدیم دور سے تعلق رکھتا ہے۔ جدید دور میں یہ عطیہ یورپ کا ہے۔ حال میں امریکہ کا بھی اور آئندہ اس کے قوی امکانات ہیں کہ پھر ایشیا اور افریقہ کا بھی اس میں حصہ ہوگا۔ میری تحریروں میں مغربی ادب کے حوالے ناگزیر ہیں۔ میں اُس نسل کا فرد ہوں جو مغرب کے اثر کو مجموعی طور پر اچھا سمجھتی ہے اور اُس نسل کے لئے لکھتا ہوں جو اُردو سے واقفیت کے علاوہ انگریزی بھی تھوڑی بہت جانتی ہے۔ آج انگریزی عالمی معیاروں تک پہنچنے کے لیے ایک کلید کا کام دیتی ہے اور جو لوگ اس سے محروم ہیں وہ

---

[1] ادبِ لطیف لاہور، جنوری ۱۹۶۴ء، ص ۹

کوئی انقلابی کارنامہ سرانجام نہیں دے سکتے۔ اپنے آپ سے پوری طرح واقف ہونے کے لیے دوسروں سے بھی واقف ہونا پڑتا ہے۔ اُردو کی مشاطگی کے لئے آج صرف اُردو سے واقفیت کافی نہیں اس کے لیے انگریزی جاننا بھی ضروری ہے۔ اب کعبے کا راستہ ترکستان ہو کر جاتا ہے اور جب تک خدا کی شان نہ دیکھیں خدا کو اس طرح نہیں دیکھ سکتے جس طرح دیکھنا چاہیے ؂

rekhta

(۱۵)

---

میری چند تنقیدی تصنیفات

Hasnain Sialvi

"تنقیدی اشارے"[1] (۱۹۴۲ء) میری ان تقریروں کا انتخاب ہے جو گزشتہ چند سالوں میں آل انڈیا ریڈیو، دہلی سے مختلف موضوعوں پر نشر ہوئیں۔ ان میں سے اکثر تقریریں بعض ادبی رسالوں میں شائع ہوئیں اور پسند کی گئیں۔ . . . ریڈیو پر جو تقریریں نشر ہوتی ہیں، اُن میں اور دوسرے مقالوں یا مضامین میں فرق ہوتا ہے۔ ریڈیو میں ایک تو وقت کی پابندی ہوتی ہے، یہ اچھی بھی ہوتی ہے اور بُری بھی۔ پندرہ منٹ میں آدمی کیا کہے اور کیا چھوڑے، پھر بھی وقت کی پابندی سے یہ ضرور فائدہ رہتا ہے کہ بنیادی مسائل اور خاص خاص رجحانات یا نمایاں خصوصیات کا ذکر ہو جاتا ہے۔ ریڈیو سُننے والوں میں زیادہ تعداد ایسے لوگوں کی ہوتی ہے جو ادب کا ذوق ممکن ہے رکھتے ہوں مگر ادب سے زیادہ واقف نہیں ہوتے۔ اُن کے لیے ضروری ہے کہ بات صاف اور سلجھے ہوئے انداز میں کی جائے۔ زبان جہاں تک ہو سکے آسان ہو اور علمی تحقیق کے بجائے پیرایۂ بیان کی دلآویزی پر توجہ رہے۔

---

[1] تنقیدی اشارے، صفحہ ۵

آسان[1] زبان سے یہ مطلب نہیں کہ ادیب اپنے انداز کو چھوڑ دے یا زبان کے مخصوص آب و رنگ کو ترک کر دے بلکہ وہ اپنے انداز کو زیادہ سے زیادہ عام فہم بنائے اور اپنے سامعین کے حلقے کو وسیع کرے ..... اسے عوام کو ساتھ لینے کی خاطر اُن کی زبان میں بات کرنا اور اُنہیں کی سطح پر ان سے ملنا ہے، مگر اس سطح پر رہنا نہیں ہے، بلکہ اُسے رفتہ رفتہ بلند کرتے رہنا ہے۔ اُسے یہ بات ذہن نشین کرانا ہے کہ ادبی مسائل یا علمی مسائل بھی زندگی کے ضروری مسائل ہیں، اور اچھی، مفید اور ترقی پذیر زندگی کے لئے ان سے بھی آشنا ہونا ضروری ہے۔ ممکن ہے کہ میں اس مقصد کو واضح کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا ہوں لیکن میرے سامنے یہ مقصد ضرور تھا..... یہ تقریریں[2] (جو) دراصل آل انڈیا ریڈیو کے لیے لکھی گئی تھیں، (۱۹۴۲ء میں) بعض ضروری اضافوں کے ساتھ شائع کی گئیں)۔

"تنقیدی اشارے"[3] کا دوسرا ایڈیشن سات برس کے بعد (۱۹۴۹ء میں) شائع ہوا۔ پہلے[4] ایڈیشن پر جو تبصرے ہوئے اُن سے اس کتاب کی مقبولیت میں شبہ نہیں رہا۔ مضامین میں جو اختصار ہے وہ ریڈیو کی وجہ سے ناگزیر تھا۔ لیکن یہ ایک اور حیثیت سے مفید بھی ہے۔ اُن لوگوں کے لیے جو اُردو ادب سے دلچسپی رکھتے ہیں، لیکن اُنھیں زیادہ فرصت یا وقت میسر نہیں، یا اُن کے لیے جو چند اشاروں کی مدد سے بہت کچھ پا سکتے ہیں، یہ کتاب سود مند ہوگی۔ میں نے مڈلٹن مرے کی کتاب TENCIUNIGS کو ہر طبقے کے لیے مفید اور دلچسپ پایا اور اسی کی یہاں تقلید کی گئی ہے۔ ادب کے ادوار اس کے شہ پاروں، اس کے مشاہیر اور مخصوص کارناموں سے واقفیت اچھے ادبی ذوق کی بنیاد بن سکتی ہے۔ اس اُمید پر یہ کتاب دوبارہ شائع کی گئی)۔ "تنقیدی[5] اشارے"

---

[1] تنقیدی اشارے، ۶ [2] تنقیدی اشارے، ۸ [3] تنقیدی اشارے، ۸
[4] تنقیدی اشارے، ۹ [5] تنقیدی اشارے، ۱۰

تیسرا ایڈیشن (۱۹۵۵ء) میں شائع ہوا۔ "تنقیدی اشارے" کی مقبولیت اس بات کی دلیل ہے کہ عقلمند کو اشارہ کافی ہوتا ہے ۔

میری[1] چند ادبی تقریروں کا مجموعہ "تنقیدی اشارے" کے نام سے ۱۹۴۲ء میں شائع ہوا تھا۔ اس مجموعے کو عام طور پر ادبی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا غلط نہ ہوگا کہ میرے ادبی اور تنقیدی نقطۂ نظر سے کچھ لوگوں کو اتفاق ضرور ہے۔

دوسرا مجموعہ ("نئے اور پرانے چراغ" مطبوعہ ۱۹۴۶ء ہے) جس میں ذرا بڑے مضامین شامل ہیں۔ یہ مضمون گزشتہ چھ سات برس (۱۹۳۹ء — ۱۹۴۶ء) میں لکھے گئے اور وقتاً فوقتاً ملک کے مقتدر ادبی رسالوں میں شائع ہوئے۔ ان میں سے بعض میں کچھ اضافہ بھی کیا گیا جو اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد ناگزیر تھا لیکن عام طور پر تبدیلی زیادہ نہیں ہے۔ اس میں نئے اور پرانے ہر قسم کے ادیبوں کے متعلق مضامین ہیں اس لیے کتاب کا نام "نئے اور پرانے چراغ" تصنیف اور مصنف دونوں کی ترجمانی کر سکتا ہے۔

"نئے اور پرانے چراغ" کا پہلا[2] ایڈیشن ۱۹۴۶ء میں (بزمانۂ قیام رامپور) شائع ہوا تھا، دوسرا پاکستان میں ۱۹۵۱ء میں نکلا (۱۹۵۵ء میں) لکھنؤ سے اس کا تیسرا ایڈیشن شائع (ہوا)۔ کتاب کی مقبولیت کے لیے یہی دلیل کافی ہے۔ ان[3] مضامین کی مقبولیت میں ان کا جواز ہے۔ کچھ لوگ اب بھی مفصل کتابوں کا مطالبہ کرتے ہیں اور مضامین کے مجموعوں کو نظر انداز کرتے ہیں۔ مفصل کتابوں کی ضرورت اور اہمیت مسلّم ہے۔ اس سے کسے انکار ہوگا، مگر تنقیدی مضامین کی گنجائش پھر بھی باقی رہتی ہے اور مغرب میں تو ایسے متعدد تنقیدی مضامین لکھے گئے ہیں جو پوری پوری کتابوں پر بھاری ہیں۔ اس لیے ہمیں حسن کو ہر رنگ میں پہچاننا چاہیے، کسی ایک خاص رنگ پر اصرار نہ کرنا چاہیے۔ ہمیں اُردو

---

۱؎ نئے اور پرانے چراغ، ۹ ۲؎ نئے اور پرانے چراغ، ۱۱ ۳؎ نئے اور پرانے چراغ، ۱۵

تنقید کے معیار کو اور بلند کرنا ہے اور اسے عالمی معیاروں تک لانا ہے، اس کے ہر پہلو میں اور سنجیدہ کوشش اپنا جواز آپ ہے۔

(میرے تیسرے تنقیدی) مجموعے کے نام[1] "تنقید کیا ہے؟" سے یہ غلط فہمی ہو سکتی ہے کہ ساری کتاب تنقید کے اصولوں سے متعلق ہوگی حالانکہ کتاب کا آخری مضمون کتاب کا عنوان ہے۔ یہ روش اُردو میں اب غیر معروف نہیں ہے اور شاید یوں بھی دوسری تنقیدوں میں اس سوال کا جواب دیکھنے والوں کو مل جائے۔ اس کتاب[2] کا پہلا ایڈیشن جون ۱۹۴۷ء میں شائع ہوا اور اس کے کچھ دن بعد ہی تقسیم کے ہولناک نتائج سامنے آنے لگے۔ انسانیت کی کس قدر متاعِ عزیز اس ہنگامۂ دار و گیر میں لٹ گئی، اس کا تذکرہ اب فضول ہے..... اس کتاب کے ناشرین بھی آگ کی لپیٹ میں آ گئے۔ خدا جانے کتنی کتابیں ضائع ہوئیں جو بچیں وہ رفتہ رفتہ بازار کی مانگ کی نذر ہو گئیں۔ چند مہینے ہوئے (۱۹۵۱ء کی بات ہے) مکتبۂ جامعہ (لمیٹڈ) نے مجھے اس کے دوسرے ایڈیشن کی طرف توجہ دلائی۔

میں چاہتا تھا کہ کتاب پر ذرا اطمینان سے نظرِ ثانی کر لوں مگر موجودہ مصروفیات (صدر شعبۂ اُردو و فارسی، لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ) نے اس کی مہلت نہ دی، پھر پانچ چھ سال پہلے کے مضامین کو زیادہ بدلنا بھی میں نے مناسب نہیں سمجھا۔ کتاب[3] کا ادبی حلقوں میں جو خیر مقدم ہوا ہے، اُس سے مجھے بڑی تسکین ہوئی ہے:

گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں
یہاں اب مرے رازداں اور بھی ہیں

"ادب اور نظر یہ" میرے تنقیدی مضامین کا چوتھا مجموعہ[4] ہے (مطبوعہ لکھنؤ ۱۹۵۳ء)

---

[1] تنقید کیا ہے، ۱۲ [2] تنقید کیا ہے، ۱۴ [3] تنقید کیا ہے، ۱۵
[4] ادب اور نظر یہ، ۵

— اس مجموعے میں تیرہ مضامین شامل ہیں۔ ان میں سے بیشتر ادبی رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ مضامین[1] کے مجموعوں کے خلاف اب بھی کچھ حلقوں میں ایک تعصب ہے۔ لوگ ایک موضوع پر ایک کتاب کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، چاہے اس میں رطب و یابس سبھی کچھ کیوں نہ ہو۔

انگلستان اور امریکہ میں کئی ایسے ممتاز نقاد ہیں جن کے مضامین نے مستقل کتابوں سے زیادہ تنقیدی شعور کو بیدار کیا ہے۔ سنجیدہ نظر معیار کو دیکھتی ہے صفحات کی تعداد پر غور نہیں کرتی۔ ظاہر ہے اُردو میں ابھی اچھے تنقیدی مضامین کی بھی ضرورت ہے اور پوری کتابوں کی بھی۔ یہ ضرور ہے کہ جب حُسن "ہزار شیوہ" ہو تو کبھی کبھی عشق کو "ہزار داستاں" بھی ہونا پڑتا ہے۔ "ادب اور نظریہ" کتاب[2] کا نام یہ ظاہر کرتا ہے کہ حقائق کی کثرت میں نظر کی ایک وحدت کی ضرورت ہمیشہ رہتی ہے۔

میری[3] ایک اور کتاب "مسرت سے بصیرت تک" اکتوبر ۱۹۷۴ء میں نکلی۔ اس[4] کا نام مشہور امریکن شاعر رابرٹ فراسٹ کے ایک قول سے لیا گیا ہے جو شاعری کے متعلق ہے۔ بات وہی پرانی، لُطف اور درس دینے والی ہے، مگر فراسٹ مسرت سے آغاز کر کے اور بصیرت پر ختم کر کے میرے نزدیک شاعری کے اثر کو زیادہ خوبی سے واضح کرتا ہے۔ میں نے (WISDOM) کا ترجمہ بصیرت کیا ہے، کیوں کہ عقل مندی، سوجھ بوجھ، دانش مندی سے فراسٹ کا مفہوم ادا نہیں ہوتا۔ شاعری علم عطا نہیں کرتی، بصیرت دیتی ہے جو نالج (KNOWLEDGE) سے مختلف ہے لیکن جو نالج سے کم نہیں۔ بقول نارتھروپ فرائی شاعری باطنی حقیقت کی کمی روداد سے تراوش کر سکتی ہے۔ کیوں کہ یہ خود روحانی حقیقت کی زبان ہے۔ اس نکتے کو عام طور پر نہ سمجھنے کی وجہ سے

---

[1] و [2] ادب اور نظریہ، ۸ [3] مکتوب آلِ احمد سرور، ۱۲ مئی ۱۹۷۵ء بنام ڈاکٹر سید معین الرحمن

[4] مسرت سے بصیرت تک، ۷

ایک طرف قدیم اور جدید کی بحث میں لوگ اُلجھ جاتے ہیں، دوسری طرف مقصدی شاعری اور غیر مقصدی شاعری کی۔

شاعر سے ہمارا مطالبہ صرف یہ ہو کہ وہ اپنی نظر سے وفادار ہو، اب اُس کی نظر ہمیں (کہاں) لے جائے..... اسے اس کی پوری آزادی ہے۔ اسی طرح اُسے یہ بھی آزادی ہے کہ وہ اپنی شاعری میں زبان کو جس طرح چاہے استعمال کرے؛ شرط صرف یہ ہے کہ وہ شاعری کی زبان ہو۔ اس زبان میں روایت یا قواعد کا علم مفید ہوگا، مگر حسبِ ضرورت اس سے آگے بھی جانا پڑے گا۔

اُردو میں جاگیردارانہ روایات کی وجہ سے یا قدامت پسندی کی وجہ سے، یا حُریتِ فکر کی کمی کی وجہ سے پٹڑی پر چلنا عام ہے اور یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ کچھ لوگ جو پٹڑی پر چلنے کا ڈسپلن نہیں جانتے، وہ اِدھر اُدھر بھاگ دوڑ کو ہی سب کچھ سمجھ لیتے ہیں، اس لیے روایت کا علم ہی نہیں عرفان بھی ضروری ہے اور اس کے بعد تجربے سے ہمدردی اور تجربے کے لیے اپنی آغوش وا رکھنا بھی۔ شاعری کی مسرت اور اس کے نتیجے میں بصیرت بڑا مرتب ذہن، بڑی ماہر نظر اور بڑا حساس مزاج چاہتی ہے۔ نادان لوگ کلیوں پر قناعت کر لیتے ہیں حالانکہ گلشن میں تنگیٔ داماں کا علاج بھی ہے۔

اس مجموعے (مسرت سے بصیرت تک) میں جو مضامین ہیں، ان میں شاعروں کا ہی مطالعہ کیا گیا ہے، صرف (ایک مضمون) میں نثر کا ذکر ضمناً آگیا ہے..... میں نے مناسب یہ سمجھا کہ یہ مضامین جس طرح عام اجتماعات میں پڑھے گئے یا رسالوں میں چھپے تھے ویسے ہی شائع ہوں، اس لیے ان میں تراش خراش نہیں کی گئی۔

اگر ہم اپنے پورے شعری سرمائے پر غور سے نظر ڈالیں تو ہمیں اس کے رنگا رنگ حُسن، اس کی گہرائی اور گیرائی اور اس کے بدلتے رہنے اور اس بدلتے رہنے کے باوجود اپنے منصب سے وفادار

---

۱؎ مسرت سے بصیرت تک، ۸ ۲؎ مسرت سے بصیرت تک، ۸ ۳؎ مسرت سے بصیرت تک، ۹

رہنے کا احساس ہو جائے گا اور یہ احساس ہمیشہ مسرت بھی دے گا اور بصیرت بھی۔ یہ مجموعۂ مضامین اسی مسرت اور بصیرت کی طرف متوجہ کرنے کی ایک حقیر کوشش ہے۔

اکتوبر ۱۹۷۳ء میں "نظر اور نظریے" نکلی تھی جس پر ساہتیہ اکیڈمی نے ایوارڈ دیا۔ "نظر اور نظریے" میں[1] میرے تیرہ مضامین شامل ہیں۔ ان میں برنارڈ شا پر مضمون کو چھوڑ کر جو اس صدی کی چھٹی دہائی کی ابتدا میں لکھا گیا تھا، باقی مضامین ساتویں دہائی کے ہیں اور مجموعی طور پر ان میں ادب اور ادبی مسائل کے بارے میں میرے وہ خیالات مل جائیں گے جو میرے نزدیک ادب کے طالب علموں کو ادب، اس کے اہم اصناف اس کی قدروں اور ان سب کی نئی بصیرت کے متعلق غور و فکر کا خاصا سامان فراہم کر سکتے ہیں۔ شرط صرف یہ ہے کہ طرف داری کے بجائے سخن فہمی کی کوشش کی جائے۔

اردو میں تنقید پہلے سے کافی آگے بڑھی ہے مگر چونکہ ابھی تک ادب کو اس کا حقیقی مقام نہیں دیا گیا، اس کی اپنی عظمت اور قدر و قیمت کا احساس عام نہیں ہے۔ اُسے مذہب، سیاست، اخلاق، غرض کسی نہ کسی موضوع کے مددگار کی حیثیت سے دیکھا گیا ہے۔ اس لیے اب بھی ادبی قدر و قیمت متعین کرتے وقت مذہبی، سیاسی، اخلاقی قدروں کو بہت زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ ادب، مذہب، سیاست، اخلاق سے بے نیاز ہو سکتا ہے، مطلب صرف یہ ہے کہ ادب کی اپنی مخصوص بصیرت پر اصرار کیا جائے۔ یہ بصیرت، مذہب سیاست اور اخلاق سے بھی غذا حاصل کرتی ہے لیکن اس کا مقصد تخیل کی بیداری، ذہنی اور جذباتی زندگی کی بہتر تنظیم اور زندگی کی نیرنگی اور اس کے ہزار شیوہ حُسن کا بہترین عرفان ہے۔ اصلاحی اور انقلابی تحریکوں سے بھی ادب کو فائدہ پہنچا ہے اور ادب؛ سیاسی

---

[1] مکتوب آلِ احمد سرور، ۱۲۔ مئی ۱۹۷۵ء، بنام: ڈاکٹر سید معین الرحمٰن

[2] ادب اور نظریہ، ۵

مذہبی، اور اخلاقی موضوعات سے بھی مدد لیتا ہے اور لیتا رہا ہے — مگر یہ نہ مذہب کا خادم ہے، نہ سیاست کا نقیب، نہ اخلاق کا نائب۔ ادب ہر جائی ہے اور آپ کا ہرجائی پن ہی اس کی دولت ہے۔ یہ معلومات میں تاثرات عطا کرتا ہے۔ یہ علم نہیں عرفان دیتا ہے۔ یہ نظریہ نہیں، نظر بخشتا ہے۔ یہ مذہب، سیاست، اخلاق سے بڑا ہے، نہ چھوٹا، ان سب کو نظر میں رکھتا ہے، مگر اپنی راہ چلتا ہے.....

ادب[1] کا اچھا طالب علم وہ ہے جو روایت سے اچھی طرح واقف ہو، اور تجربے کے ساتھ ہمدردی رکھتا ہو۔ جس طرح ادب میں روایت پرستی بری ہے، اسی طرح تجربہ برائے تجربہ بھی سراہا نہیں جا سکتا۔ مگر تجربے کے لیے ذہن کی کھڑکی کھلی رکھنی ضروری ہے۔ چونکہ مجموعی طور پر آج بھی قدامت پرستی زیادہ ہے، اس لیے تجربے کی اہمیت اور ضرورت پر زور دینا میرے نزدیک آج کا اہم فریضہ ہے۔ یک طرفہ ذہن، سادہ ذہن ہوتا ہے۔ آج "یہ" یا "وہ" کی ضرورت نہیں؛ "یہ بھی" اور "وہ بھی" کی ضرورت ہے۔

ادب میں کوئی شخصیت مقدس نہیں ہے اور کوئی میلان حرفِ آخر نہیں ہے، زندگی میں بھی نہیں — تنقیدی ذہن بہت بڑی دولت ہے۔ جذبات سے بچنے کی ضرورت نہیں، لیکن جذباتیت سے بچنے کی ضرورت ہے — اپنے مخصوص تہذیبی ورثے، اپنی ادبی روایات، اپنی دھرتی اور اپنے اُفق کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ مگر مخصوص روایات بھی عالمی، روایات کی لے ہوتی ہیں۔ اُردو کے مخصوص مزاج کا لحاظ رکھنا مفید ہے۔ مگر اُردو ادب کو ملکی اور عالمی ادب کے معیاروں کی روشنی میں دیکھنا میرے نزدیک زیادہ ضروری ہے۔

• نظر اور نظریے" کے مضامین مختلف اوقات میں لکھے گئے اور علمی و ادبی اجتماعوں میں پڑھے گئے۔ کہیں کہیں بعض الفاظ یا خیالات کی تکرار بھی مل جائے گی جس کے لیے میں معذرت خواہ ہوں —

---

[1] نظر اور نظریے، ۶-۷

غالبؔ کی صد سالہ برسی (۱۹۶۹ء) کے موقع پر پورے ہندوستان میں اور ہندوستان کے علاوہ پاکستان میں نیز اُن ممالک میں جہاں تھوڑا بہت اُردو سے شغف ہے، بڑے پیمانے پر غالب کی یادگار میں اجتماع ہوئے۔ غالب کے متعلق نئے زاویے سے مضامین لکھے گئے اور نئی کتابوں میں اُن کی عظمت کا نئے سرے سے جائزہ لیا گیا۔

(میرا مُرتبہ) مجموعۂ مضامین "عرفانِ غالب" (ستمبر ۱۹۷۳ء) بھی اسی اعتراف اور سعیٔ عرفان کی ایک کوشش ہے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی طرف سے مارچ ۱۹۶۹ء میں (ایک) سیمینار ہوا تھا۔۔۔۔ سیمینار میں جو مضامین پڑھے گئے تھے، اُن میں سے دو تین کو چھوڑ کر جو باوجود تقاضوں کے موصول نہیں ہوئے، باقی سب مضامین اس مجموعے میں شامل ہیں اور مجھے یقین ہے کہ اُن کے مطالعے سے غالب کی بصیرت میں خاصا اضافہ ہوگا۔ غالبؔ کا مطالعہ کیجیے تو اپنی زبان، اپنے ادب اور اپنی تہذیب سے محبت اور بڑھ جاتی ہے، یہی اس مجموعے (عرفانِ غالبؔ) کی اشاعت کا جواز ہے۔

اقبال کے صد سالہ جشنِ ولادت (۱۹۷۷ء) کے موقع پر لاہور سے زہرا معین نے میرے اقبال پر مضامین کا مجموعہ "عرفانِ اقبال" کے نام سے چھپوایا ہے۔ یہ مضامین جس طرح مُرتب ہوئے ہیں ان کا اگرچہ مجھے پہلے سے علم نہ تھا، مگر ان کی ترتیب کا حُسن اور خصوصاً دوسرے مضامین میں اقبال کے متعلق اشارات کا شمول ہر لحاظ سے قابلِ قدر ہے اور اس طرح اقبال کے متعلق میرے جو خیالات ہیں اُن کو سمجھنے میں بڑی مدد ملے گی۔

کہیں کہیں (عرفانِ اقبال کے) ان مضامین میں جو تکرار ہے وہ اگر دور کی جاتی تو سارے مضامین کو دوبارہ لکھنا پڑتا۔ زہرا معین نے اس سلسلے میں جو محنت کی ہے، اس کا اعتراف ہر ادب دوست کے لیے ضروری ہے۔

---

۱ عرفانِ غالب، ۵ ۲ عرفانِ غالب، ۶ ۳ عرفانِ غالب، ۱۰

۴ روزنامہ مشرق، لاہور، ۸۔مئی ۱۹۷۹ء ۵ قلمی تحریر: آلِ احمد سرور، لاہور، ۵۔جنوری ۱۹۷۸ء

rekhta

(۱۶)

# کچھ دن پاکستان میں

۹- دسمبر ۱۹۷۷ء[1] کو رسالہ "نقوش" لاہور کے اقبال نمبر (۳) کی رسم اجراء میں تقریر کرتے ہوئے میں[2] نے کہا تھا:

"اس برصغیر میں صرف تین شہر ہیں۔ لاہور، لکھنؤ اور حیدرآباد، باقی گاؤں ہیں۔ یورپ میں شہر پیرس، روم اور لینن گراڈ ہیں۔ شہر وہ ہوتا ہے جس کی شخصیت ہوتی ہے، جس کے ساتھ افسانہ وافسوں کی روایت ہوتی ہے، جس کے پیچھے تہذیب کی صدیوں کی کمائی ہوئی دولت ہوتی ہے۔ شہر وہ ہے جس سے عشق کیا جا سکے، جس کے خواب دیکھے جا سکیں۔"

---

[1] روزنامہ "مشرق" لاہور، ۱۷- اپریل ۱۹۷۹ء

[2] ادارۂ "نقوش" کے زیر اہتمام جشنِ اقبال کے سلسلے کی یہ تقریب لاہور کے ایک ہوٹل میں منعقد ہوئی جس میں عالمی اقبال کانگریس میں حصہ لینے والے مندوبین میں سے اٹلی کے ڈاکٹر بوسانی، ہندوستان کے علی سردار جعفری، پروفیسر آلِ احمد سرور، پاکستان سے ڈاکٹر سید معین الرحمٰن ڈاکٹر عبدالسلام خورشید اور سلیم اختر نے علامہ اقبال کو خراجِ عقیدت پیش کیا اور ادارۂ "نقوش" کی خدمات کو بھی سراہا۔ [روزنامہ مشرق، لاہور، ۱۱- دسمبر ۱۹۷۷ء، ص ۴]

جب میں لاہور جانے والا تھا تو دہلی میں ایک پرانے پاپی نے جو آج بھی لاہور کی رنگا رنگ بزم آرائیاں یاد کرتا رہتا ہے، مجھ سے کہا تھا کہ لاہور کو میرا سلام کہہ دینا۔ میں نے اس جلسہ میں یہ سلام پہنچا دیا تھا۔

میں ۱۹۴۲ء میں لاہور گیا تھا۔ اس کے بعد جانے کی نوبت نہیں آئی تھی۔ اب کے بین الاقوامی اقبال کانگریس میں شرکت کا دعوت نامہ ملا تو بہت شوق سے گیا۔ مگر بقولِ حسرت "تماشا کامیاب آیا، تمنا بے قرار آئی"۔ پاسپورٹ ملنے میں دیر ہوئی، اس لیے بجائے یکم دسمبر ۱۹۷۷ء کے ۳۔ دسمبر کی سہ پہر کی پرواز سے گیا۔ کانگریس دوسری دسمبر سے شروع ہو چکی تھی۔ لاہور کے ہوائی اڈے پر کانگریس کے کارکن موجود تھے جنہوں نے پہلے مجھے وی آئی پی لاؤنج میں پہنچایا اور پھر انٹر کانٹی نینٹل ہوٹل میں لے گئے جہاں بیرونی اور مقامی سبھی مہمانوں کے قیام و طعام کا انتظام کیا گیا تھا۔ کانگریس کے اجلاس ۷۔ دسمبر تک ہوئے۔ ۸۔ دسمبر کو مہمانوں کو سیالکوٹ لے جانے کا پروگرام تھا۔ یہ کانگریس پنجاب یونیورسٹی کے زیرِ اہتمام تھی۔ سارے انتظامات بہت اچھے تھے۔ دوپہر تک مقالات کے اجلاس ہوتے تھے۔ سہ پہر میں استقبالیے اور سیر کے پروگرام۔ رات میں کھانے کے بعد موسیقی کے پروگرام۔ چونکہ مقالات کی تعداد زیادہ تھی اس لیے صبح سے دوپہر تک ہوٹل کے دو ہالوں میں ساتھ ساتھ جلسے ہوتے تھے اور ہر اجلاس میں سولہ مقالات کا خلاصہ پیش کیا جاتا تھا، یا ان کا تعارف ہوتا تھا۔ بحث کے لیے وقت بھی نہ ملتا تھا۔ سیلاون افتتاح اور جاوید منزل اور مزارِ اقبال پر حاضری کی نذر ہو گیا پھر ۷۔ دسمبر کو فیصل آڈیٹوریم میں جنرل محمد ضیاء الحق نے کانفرنس سے خطاب کیا۔ باقی چار دن میں سوا سو کے قریب مقالوں کا تعارف ہوا۔ ہندوستان سے میرے علاوہ جگن ناتھ آزاد، علی سردار جعفری، اور صباح الدین عبدالرحمان شریک تھے۔ سب سے بڑی تعداد ترکی سے آنے والوں کی تھی۔ بنگلہ دیش کے چھ اسکالر آئے تھے۔ اس کے علاوہ کینیڈا، چیکوسلواکیہ

مصر، فن لینڈ، فرانس، انڈونیشیا، عراق، اٹلی، جاپان، کویت، لبنان، ملائشیا، ہالینڈ، فلپائن، رومانیہ، اسپین، سری لنکا، سوڈان، سوئٹزرلینڈ، شام، مغربی جرمنی، تونس، بلجیم، ایران، برطانیہ اور امریکہ سے اسکالر آئے تھے۔ ان کی مجموعی تعداد ستر سے اوپر تھی۔ سو سے اوپر پاکستان کے اسکالر تھے۔ ان میں ادیب بھی تھے، مگر یونیورسٹیوں کی نمائندگی زیادہ تھی۔ بیرونی اسکالروں میں یان مارک، پروفیسر یوسانی، باربر شمکاف، سیلامیک، پروفیسر عبدالقادر قراہان (ترکی)، رالف رسل اور ایک آئرش خاتون نے جنہوں نے اقبال اور ڈبلو، بی، یٹس کا موازنہ کیا تھا متاثر کیا۔ پاکستانی اسکالروں میں ڈاکٹر جاوید اقبال، ایس۔ اے رحمٰن، ڈاکٹر ضیاالدین صدیقی، فیض احمد فیض، ڈاکٹر اجمل، ڈاکٹر باقر، ہادی حسین، پروفیسر کرار حسین، ڈاکٹر شکور احسن، بشیر احمد ڈار، عبدالسلام خورشید، میاں امیرالدین، رفیق خاور، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، سید عبدالواحد، ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر عبادت بریلوی، ڈاکٹر سید معین الرحمٰن، رفیع الدین ہاشمی، ڈاکٹر معزالدین، پروفیسر مجتبیٰ حسین، ابوالخیر کشفی، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، اور وحید قریشی قابل ذکر ہیں۔ ڈاکٹر عبداللہ اور نذیر نیازی سے کانفرنس کے دوران ملاقات ہوئی۔ جوش ملیح آبادی اور حفیظ جالندھری معلوم نہیں کیوں نظر نہیں آئے۔ مقالات میں اقبال کے مذہبی افکار، فلسفے اور سیاسی افکار پر توجہ زیادہ تھی، گو ان کی شاعری، شخصیت اور زندگی پر بھی مقالے خاصی تعداد میں تھے۔ استقبالیوں میں شالامار باغ میں اہالیانِ شہر کی طرف سے استقبالیہ نہایت شاندار تھا۔ پورے شالامار باغ کو دلہن کی طرح سجایا ہوا تھا اور فوارے رنگ و بو کی بارش کر رہے تھے۔ اقبال کی صاحبزادی منیرہ کی طرف سے بہت بڑے پیمانے پر ضیافت تھی۔ ڈاکٹر جاوید اقبال نے مخصوص مہمانوں کو بلایا تھا۔ خوش قسمتی سے میں اور میری بیوی بھی شریک تھے۔ جنرل محمد ضیاء الحق نے خطاب کرنے کے علاوہ ایک دن پہلے ایک استقبالیہ بھی دیا تھا۔

اقبال سے ان کا گہرا شغف، ان کے فکر و فن سے آگاہی کا آئینہ دار تھا۔ انھوں نے حکومت کی طرف سے بیرونی مہمانوں کو لاہور کے علاوہ کراچی، اسلام آباد یا پشاور جانے کی سہولتیں فراہم کیں۔ میں نے کراچی کا انتخاب کیا، جہاں کی یونیورسٹی کی طرف سے لیکچر کی خاص دعوت تھی۔

کانگریس کے موقع پر اقبال کی تصانیف اور اقبال پر تصانیف کی نمائش بھی ہوٹل ہی میں تھی۔ اس میں سات سو کے قریب نئی اور پرانی کتابیں رکھی گئی تھیں۔ اس کے علاوہ تصاویر اور مجسموں کی نمائش بھی تھی۔ مہمانوں کو خاصے قیمتی تحفے بھی دیئے گئے۔ جن میں کتابوں کے علاوہ ایک سنہرا میڈل بھی تھا اور اقبال کی کچھ غزلوں کا ٹیپ بھی۔ اقبال اکیڈمی نے اس موقع پر چالیس سے زیادہ کتابیں شائع کیں۔ کچھ کتابیں ابھی چھپ رہی ہیں۔ خوشی کی بات ہے کہ اس موقع پر میرے علی گڑھ کے استاد خواجہ منظور حسین صاحب کی کتاب "اقبال اور دوسرے شعرا" منظرِ عام پر آگئی۔ اس کا ایک مدت سے انتظار تھا۔ بعض قابلِ ذکر کتابیں یہ ہیں:

سرگزشتِ اقبال از عبدالسلام خورشید۔ اقبال کی فارسی شاعری عبدالشکور احسن۔ کتابیاتِ اقبال، رفیع الدین ہاشمی۔ انتخابِ کلامِ اقبال صوفی غلام مصطفیٰ تبسم۔ انوارِ اقبال (نیا ایڈیشن) بشیر احمد ڈار۔ معاصرینِ اقبال کی نظر میں عبداللہ قریشی۔ اقبال اور مسلکِ تصوف ابواللیث صدیقی۔ اقبال کے محبوب صوفیا اعجاز الحق قدوسی۔ اقبال کی نثر عبادت بریلوی۔ تصوراتِ عشق و خرد وزیر آغا۔ ہادی حسین کا پیامِ مشرق کا اور بشیر احمد ڈار کا پس چہ باید کرد کا انگریزی ترجمہ۔

۴۔ دسمبر کو جب میں اقبال نمائش دیکھ رہا تھا ڈاکٹر قریشی میرے پاس آئے اور انھوں نے بتایا کہ مشہور مصور عبدالرحمان چغتائی کے صاحبزادے اور بھائی آپ سے

---

لہ مشرق، لاہور، ۲۴۔اپریل ۱۹۷۹

ملنا چاہتے ہیں، اور آپ کو چغتائی کا آخری شاہکار "عملِ چغتائی" نذر کرنا چاہتے ہیں۔ یہ نادر مرقع میں کشمیر یونیورسٹی لائبریری میں دیکھ چکا ہوں اور یہ حسرت تھی کہ کسی طرح اسے حاصل کر سکتا۔ ہندوستان میں کچھ لوگوں کے پاس بھی یہ مرقع ہے۔ چنانچہ قریشی صاحب کے کہنے پر میں ان لوگوں سے ملا۔ انھوں نے میرے ساتھ تصویر کھچوائی اور "عملِ چغتائی" میری نذر کیا۔ میں اس بات سے خاص طور سے متاثر ہوا کہ مرنے سے پہلے چغتائی مرحوم وصیت کر چکے تھے کہ مرقع میری نذر کر دیا جائے۔ اس مرقع میں چغتائی نے اقبال کے موضوعات اور اشعار کو تصویروں کے قالب میں ڈھالا ہے۔ مصوری کے لحاظ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہند اسلامی تہذیب اس کے نقوش اور اس کی روایات کا یہ ترجمان "ترکش مارا خدنگ آفریں" کے مصداق ہے، کیونکہ برصغیر میں اب عام طور پر تجریدی میلانات کارفرما ہیں۔ اس مرقع میں ہر تصویر گویا منہ سے بول رہی ہے۔ رنگوں اور خطوط کی دلآویزی، فضا آفرینی، نقوش کی بلاغت میں چغتائی کا فن اپنے عروج پر ہے۔ اس مرقع میں ایس اے رحمٰن کا انگریزی میں تعارف اور اقبال کی متعدد منتخب نظموں اور غزلوں کے انگریزی ترجموں کے ساتھ جا بجا چغتائی کی اپنی تشریحات ہیں۔ تصویروں میں — داستان گو، جہانِ رنگ و بو، غلام لڑکی، زوالِ بغداد، اخترِ صبح اور جلال و جمال صرف تصویریں نہیں تصور کی کہانیاں ہیں۔

کانگریس کے دوران جاوید اقبال اور منیرہ سے مل کر ایسا لگا کہ میں اقبال کا جلال و جمال دیکھ رہا ہوں۔ جاوید اقبال، اقبالؔ کی جوانی کی یاد دلاتے ہیں۔ مجھے خوشی ہے کہ جب وہ آخر دسمبر (۱۹۷۸ء) میں ہندوستان آئے تو ان کا بڑا پر جوش استقبال کیا گیا۔

جاوید منزل کو اب قومی ملکیت میں لے لیا گیا ہے اور اقبال کی ہر چیز اور ہر کاغذ جو موجود تھا وہاں محفوظ ہے۔ اس کانگریس میں جسٹس ایس۔ اے۔ رحمٰن اور صوفی تبسم سے مل کر مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ رحمٰن صاحب نہ صرف اقبال کے فکر و فن پر گہری نظر رکھتے ہیں بلکہ پاکستان کے ان بزرگ دانشوروں میں سے ہیں جنھوں نے بہت سوں کے ذوق اور ذہن کی تربیت کی ہے۔ صوفی تبسم، افسوس ہے چند روز ہوئے اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ میری ان کی پہلی اور آخری ملاقات ۹۔ دسمبر ۱۹۷۸ء کو جنرل ضیاء الحق

کے استقبالیے میں ہوئی۔ لطف یہ تھا کہ ہم لوگ ایک دوسرے سے پہلی بار ملے تھے۔ مگر ایسا لگا کہ برسوں سے ملاقات تھی۔ انھوں نے بتایا کہ انھوں نے اقبال کے فارسی کلام کا اردو میں اور اردو کا پنجابی میں ترجمہ بھی کیا ہے۔ پطرس بخاری کے مرنے پر فیض نے ان پر ایک مضمون میں لکھا تھا کہ ۱۹۴۲ء میں جب کانگریس چھوڑو کی تحریک شروع ہوئی تو پطرس آل انڈیا ریڈیو کے ڈائرکٹر تھے۔ مسز آصف علی جن کے پطرس سے اچھے خاصے مراسم تھے، وہ اس تحریک میں بہت سرگرم تھیں اور ان کے خلاف وارنٹ گرفتاری تھا جس کا اعلان روز ریڈیو پر ہوتا تھا حالانکہ وہ خود ڈائرکٹر جنرل کے گھر میں روپوش تھیں۔ میں نے باتوں کے دوران صوفی تبسم سے اس واقعے کی تصدیق چاہی تو انھوں نے کہا کہ فیض نے بالکل صحیح لکھا ہے۔ میں نے پطرس سے پوچھا کہ آپ نے یہ کیوں کیا؟ انھوں نے جواب دیا کہ صوفی اگر تم کسی کو قتل کر کے رات کے بارہ بجے میرے یہاں پناہ لینے آتے تو کیا میں تمہیں پناہ نہ دیتا۔ مسز آصف علی سخت سراسیمگی کے عالم میں ایک رات ایک رفیق کے ساتھ میرے یہاں آئیں اور مجھ سے کہا کہ میں انہیں پناہ دوں، کیونکہ پولیس ان کی تلاش میں ہے۔ چنانچہ میں نے پناہ دے دی۔ دوستی کے آداب کوئی ان لوگوں سے سیکھے۔ یاد آتا ہے کہ فارسٹر نے بھی کسی مضمون میں دوستی کے اسرار و رموز پر روشنی ڈالی ہے۔ صوفی کی عمر اس سے دو ایک سال کم ہوگی مگر وہ جوانوں سے زیادہ زندہ اور حسینوں سے زیادہ دلکش نظر آتے تھے۔ افسوس ہے کہ نیاز مندانِ لاہور کے حلقے کا یہ آخری ستون بھی گر گیا۔

پاکستان ریڈیو اور پاکستان ٹی وی اقبال کانگریس کے اجلاسوں کی کارروائی برابر نشر کر رہے تھے۔ بیرونی ممالک کے مہمانوں کے انٹرویو بھی لیے جا رہے تھے۔ میرا ایک انٹرویو ٹی وی کے لیے کشور ناہید نے لیا تھا۔ ایک ہندوستان سے آئے ہوئے ساتھیوں کے ساتھ اور ہوا جو خاصا طویل تھا۔ کشور ناہید اب آہ نو کی چیف ایڈیٹر ہیں اور انھوں نے اس پرچے میں جان ڈال دی ہے۔ میرے نزدیک یہ برصغیر کے چوٹی کے انٹرویو کرنے

والوں میں شمار کی جاسکتی ہیں۔ انھوں نے اقبال کے علاوہ ہندوستان میں اُردو اور جدیدیت کے میلان پر بھی ایسے سوالات کیے جن میں ذہانت بھی تھی اور نظر بھی۔ کانگریس کے دوران ڈاکٹر سید عبداللہ سے بھی ملاقات ہوئی۔ انھوں نے اپنی کتاب 'دلی سے اقبال تک' مجھے نذر کی۔ ڈاکٹر سید عبداللہ اُستاد الاساتذہ ہیں اور اُنھوں نے کئی نسلوں کے ذہن کی تربیت کی ہے مگر ابھی وہ تبرک نہیں ہوئے۔ احسان دانش سے کوئی چالیس سال کے بعد ملاقات ہوئی مگر ان کی آنکھوں میں وہی تیزی اور ان کے مزاج میں آج بھی وہی درویشانہ تمکنت ہے جو پہلے بھی تھی۔ انھوں نے اپنی خود نوشت بھی عنایت کی۔ شورش کاشمیری مرحوم سے میری ملاقات کبھی نہیں ہوئی مگر ہم لوگوں کی خاصی مراسلت تھی۔ ان کے یہاں عطاء اللہ شاہ بخاری کی خطابت اور ظفر علی خاں کی صحافت اور شاعری کا امتزاج تھا۔ ابوالکلام آزاد اور اقبال دونوں سے عقیدت کی وجہ سے ہم دونوں ذہنی طور پر مانوس تھے۔ ان کے گھر تعزیت کے لیے گیا تو وہاں ایسی محبت اور انسانیت ملی کہ میں بھول گیا کہ میں پردیسی ہوں۔ خوشی ہے کہ 'چٹان' اب بھی بڑی آن بان سے نکل رہا ہے مگر شورش مرحوم کی شعلہ بیانیاں اب کہاں۔ ایک کالج کے مشاعرے میں جہاں سردار جگن ناتھ آزاد اور میں بھی مہمانِ خصوصی تھے اور جس کی فیض صدارت کر رہے تھے، احمد ندیم قاسمی، قتیل شفائی، وزیر آغا، سیف زلفی، انور سدید اور لاہور کے کئی نئے اور نوجوان شعراء سے ملنے اور ان کا کلام سُننے کا اتفاق ہوا۔ لاہور کے نوجوان شعراء میں تخلیقی توانائی محسوس ہوئی۔ ادھر قدرتی طور پر سیاسی حالات پر توجہ زیادہ ہے۔ ایک نوجوان شاعر کا یہ شعر اس زمانے میں ادبی حلقوں میں خاصا مقبول تھا ؎

دیوار کیا گری مرے خستہ مکان کی
لوگوں نے میرے صحن میں رستے بنالیے[1]

احمد فراز نے ۹۔ نومبر کے اقبال کی یاد میں مشاعرے میں یہ شعر پڑھا تھا اس کا بھی چرچا

---

[1] یہ شعر جواں مرگ شاعر سبطِ علی صبا سے منسوب ہے۔ [بحوالہ: روزنامہ "حریت" کراچی، ۹۰ جولائی ۔۱۹۸۰ء ص ۳]

سُنا ہے

میں شب کا بھی مجرم تھا سحر کا بھی گنہگار
یارو مجھے اس شہر کے آداب سکھا دو

ڈاکٹر[1] رضی الدین صدیقی آج کل اسلام آباد میں مقیم ہیں اُنھوں نے کانگریس میں اقبال کے افکار میں سائنسی آگہی کی اہمیت پر بہت اچھا مقالہ پڑھا تھا۔ مُصر تھے کہ میں اُن کے ساتھ اسلام آباد چلوں، مگر میں صرف کراچی جا سکتا تھا۔ ڈاکٹر اجمل مالی گاؤں کے مشہور ماہرِ نفسیات ہیں، ان سے شکاگو میں آٹھ سال پہلے ملاقات ہوئی تھی۔ اب نفسیات کے نیشنل پروفیسر ہیں اور ٹیگ کے دبستان کے پیرو۔ ادب کا بھی پاکیزہ ذوق رکھتے ہیں۔ وزیر آغا "اوراق" کے مدیر اور "اردو شاعری کا مزاج" کے مصنف پاکستان میں نئے میلانات کے پُرجوش حامی اور نفسیاتی خصوصاً آرکی ٹائپل تنقید کے علمبردار۔ منیر نیازی جو بانکے شخص اور بانکے شاعر ہیں۔ انتظار حسین جو گنگا اور گومتی، راوی اور فرات کے درمیان پُل بنا رہے ہیں اور جو اس وقت اُردو کے چوٹی کے افسانہ نگاروں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ میں نے ان سے پوچھا کہ سبز پنکھیا لکھی یا نہیں، وہ مسکرا کر رہ گئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ تلاش جاری ہے۔ میرے نزدیک تو وہ سبز پنکھیا لے کر نکلے تھے۔ مسعود زیدی علی گڑھ کے کھلنڈرے جنھوں نے علی گڑھ کی یاد میں "علی گڑھ کی باتیں" کے نام سے بڑے مزے کی ایک کتاب لکھی۔ خواجہ غلام صادق جو اقبال کانگریس کے روحِ رواں تھے (وائس چانسلر تو کم ہی نظر آتے) ڈاکٹر سید معین الرحمٰن اور زہرا معین جنھوں نے میرے اقبال پر مضامین کا مجموعہ 'عرفانِ اقبال' کے نام سے چھپوایا ہے اور جو ہر وقت ہر کام کے لیے موجود تھے، اور عبادت بریلوی اور ان کی بیگم جن کے یہاں کئی دن قیام رہا، ان کے ساتھ یادوں کا ایک قافلہ ہے رنگا رنگ نور برسانے والا، دلداری اور دلنوازی کی خوشبو سے مہکتا ہوا

---

[1] روزنامہ مشرق، لاہور، ۸۔ مئی ۱۹۷۹ء

اورینٹل کالج میں ایک لیکچر دیا۔ بیگم عبادت کے کالج میں یوم اقبال میں شرکت کی جہاں رالف رسل تھے اور باربرا شکاف بھی۔ اس کالج کی لڑکیوں نے میرے اتنے آٹوگراف لیے کہ میں تھک کر بور ہوگیا۔ بے ساختہ اقبال کا یہ شعر یاد آیا ؎

گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں

یہاں اب مرے رازداں اور بھی ہیں

دو ہستیوں کا تذکرہ اور ضروری ہے۔ ایک اپنے اُستاد خواجہ منظور حسین کا جن کی پیری میں ہے مانندِ سحر رنگِ شباب اور جن کی دو اور کتابیں ہمارے کلاسیکل ادب میں جلد آرہی ہیں، دوسرے محبِ صادق محمد طفیل عرف محمد نقوش کا جو اقبال پر تین ہزار صفحے کے قریب حجم کے تین ضخیم نمبر نکال چکے ہیں (جن میں نیرنگِ خیال کا اقبال نمبر بھی شامل ہے) اقبال کے مردِ مومن کی طرح کم آمیز ہیں اور اقبال کے شعر کی طرح کارِ زندگی میں صفتِ سنگِ خارا ہیں۔ نقوش کے اقبال نمبر۳ کی رسم کی اجرا میں بہت سے لوگوں سے ملاقات ہوئی۔ حجاب امتیاز علی سے بھی ملنے کی سعادت حاصل ہوگئی۔ اس جلسے کے صدر بوسانی تھے جنہیں میں (SAINT) کہتا ہوں اور جو پیری مریدی شروع کر دیں تو آج بھی لاکھوں مرید بنالیں۔ میں تو روم میں پہلے ہی ان کے ہاتھ پہ بیعت کر چکا ہوں۔ اقبال اور دانتے پر ان کے مضامین ان دونوں شعرا پر نئی روشنی ڈالتے ہیں۔

لاہور بڑا خوبصورت شہر ہے۔ بقول فیض روشنیوں کا شہر، پینتیس برس کے بعد دیکھا تو شہر بہت پھیل گیا ہے۔ خوبصورت علاقے اور آبادیاں بڑھ گئی ہیں۔ لوگ جاندار توانا نظر آتے ہیں۔ جا بجا نہایت خوشخط کتبے اور سائن بورڈ، سڑکیں کشادہ اور روشن۔ بیگم عبادت ایک ہاکی میچ میں لے گئیں لڑکیاں لڑکوں کی طرح کھیل رہی تھیں، مگر لگتی زودگیا[۱] تھیں۔ حسن اور صحت اور زندگی ہر طرف رقصاں، لاہور اُردو کا بہت بڑا مرکز ہے۔ برصغیر

---

[۱] روزنامہ مشرق، لاہور ۱۵۔ مئی ۱۹۷۹ء

اب سب سے بڑا مرکز' یہاں مجھے لوگ کہتے ہیں کہ پنجابی کا زور بڑھ رہا ہے اور اُردو کی مقبولیت کم ہو رہی ہے۔ مجھے تو اس بات میں کوئی صداقت نظر نہیں آتی۔ بے شک یہ لوگ آپس میں پنجابی میں بات کرتے ہیں، مگر ہر طرف اُردو ہے۔ اُردو میں بڑے اچھے اخبار نکل رہے ہیں۔ امروز اور نوائے وقت لاہور سے اور جنگ' جسارت' حریت اور مشرق کراچی سے کتابیں شائع ہو رہی ہیں، ٹائپ میں چھپنے والی کتابوں کی تعداد بھی اچھی خاصی ہے۔ اخبار آفسٹ پر شائع ہوتے ہیں اور تصویریں صاف اور روشن ہوتی ہیں۔ اُردو کے کئی ممتاز ادیب اخبارات میں کالم لکھتے ہیں۔ شاعری' افسانے' تحقیق' تنقید' تراجم ہر طرح کی کتابیں شائع ہو رہی ہیں۔ مجلس ترقی ادب لاہور نے کلاسیکی ادب بڑی صحت اور نفاست سے شائع کیا ہے۔ اقبال اکاڈمی نے اقبال پر بڑی تعداد میں کتابیں شائع کی ہیں۔ ان کتابوں کی قیمت ضرور ہمارے یہاں کے مقابلے میں زیادہ ہے۔ پاکستان میں کاغذ زیادہ تر باہر سے منگوانا پڑتا ہے۔ پھر بھی لوگ کتابیں خریدتے ہیں۔ گرانی خاصی ہے، مگر ایسا لگتا ہے کہ لوگوں کے پاس روپیہ بھی ہے، خوب محنت کر کے کماتے ہیں اور دل کھول کر خرچ کرتے ہیں۔ دعوتیں بہت ہوتی ہیں۔ پاکستان کے انگریزی اخبار مجھے زیادہ نہیں جچے' ہمارے ریاستی اخباروں کی طرح ہیں۔

میں دس دسمبر ۱۹۷۰ء کو لاہور سے کراچی پہنچا اور ایسا لگا کہ ایک دوسری دنیا میں آ گیا ہوں۔ کراچی اور دہلی کی آبادی آزادی سے پہلے چار پانچ لاکھ ہو گی، اب پچاس لاکھ سے کم نہ ہو گی۔ لاہور میں اِدھر سے جانے والے زیادہ نہیں، کراچی میں قریب قریب سبھی آبادی مہاجرین کی ہے۔ سڑکوں پر اونٹ تو کم نظر آئے البتہ گدھے ضرور گاڑی کھینچتے ہوئے دکھائی دیئے اور ان کے ساتھ یخ دیکھ کر اس لفظ کے حقیقی معنی سمجھ میں آئے۔ کراچی کا شہر اُس نوعمر کی طرح ہے جس کے ہاتھ پاؤں ہر طرف بڑھ اور پھیل رہے ہیں اور جسم کچھ بے ڈھنگا سا ہے۔

ہفتہ وار اخباروں میں "اخبارِ جہاں" قابلِ ذکر ہے جو "جنگ" والے ہی نکالتے ہیں۔ رسالوں میں "افکار" پابندی سے شائع ہوتا ہے۔ "نیا دور" بھی دیر سویر نکل رہا ہے۔ گرانی یہاں بھی کافی ہے۔ مگر لوگ عام طور پر خوش حال نظر آئے۔ ادھر سے جو لوگ گئے ہیں ان میں سے اکثر نے اپنے مکان بنوا لیے ہیں۔ فرج اور ٹی وی اکثر گھروں میں ہیں، بہت سے لوگوں کے پاس اسکوٹر ہیں اور خاصی تعداد کے پاس کاریں، کاریں سب باہر کی بنی ہوئی، پٹرول ہندوستان سے سستا ہے۔ سوئی گیس کی وجہ سے ہر جگہ گیس کے چولھے ہیں۔ عام مزدور یہاں کے مقابلے میں دوگنی مزدوری لیتا ہے۔ تنخواہیں بھی یہاں کے مقابلے میں بہت بہتر ہیں، لبیں اور ٹیکیاں کم ہیں۔ کراچی یونیورسٹی میں میرے تین لیکچر ہوئے۔ ایک اور جلسے میں شرکت کی جو احمد ندیم قاسمی کے اعزاز میں ہوا تھا۔ ان کا کلام سُنا اور ایک نئی شاعرہ پروین شاکر سے ملاقات ہوئی۔

فہمیدہ[1] ریاض کے یہاں وہ بیباک حقیقت نگاری ہے جو کبھی کبھی کھل بھی جاتی ہے۔ پروین شاکر کے یہاں وہ معصومیت اور گداز، وہ حیرانی اور سپردگی ہے جس پر پیار آتا ہے کراچی یونیورسٹی میں عرصے کے بعد اختر رائے پوری کی اقبال پر سمپوزیم میں تقریر بھی سُنی جس میں مارکس کی غیر طبقاتی سوسائٹی کے ساتھ خلافتِ الٰہیہ کا بھی ذکر تھا۔ ڈاکٹر سلیم الزمان صدیقی ممتاز سائنسدان ہونے کے ساتھ ادب اور فنونِ لطیفہ کا بڑا پاکیزہ ذوق رکھتے ہیں انھوں نے اقبال کے کلام میں سائنس کے اثرات کا ذکر کیا۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی سے لاہور میں ملاقات ہو چکی تھی وہ اب اُردو بورڈ کے سیکرٹری اور اردو لغت کے ڈائرکٹر ہیں، ان کے ساتھ ترقیِ اُردو بورڈ کے دفتر گیا۔ وہاں معلوم ہوا کہ لغت کی پہلی جلد کی چھپائی ختم ہو رہی ہے اور فروری میں جنرل ضیاء الحق اس کا اجرا یونیورسٹی کی جوبلی کے موقع پر کریں گے۔ لغت کے لئے اٹھارہ برس سے کام ہو رہا ہے۔ ایک

---

[1] روزنامہ مشرق، لاہور ۲۲۔ مئی ۱۹۸۹ء

ایک لفظ کو واضح کرنے کے لیے درجنوں مثالیں جمع کی گئی ہیں۔ اُردو بورڈ کا اپنا پریس ہے اس کا کتب خانہ بھی بہت اچھا ہے۔ خصوصاً لغات کے لحاظ سے وہاں کئی اچھے اسکالر کام کر رہے ہیں۔ اس لغت کی اشاعت سے یقیناً ایک بہت بڑی ضرورت پوری ہوگی۔

مَیں انجمن ترقی اُردو پاکستان کے دفتر بھی گیا، پہلے بابائے اُردو مولوی عبدالحق کے مزار پر فاتحہ پڑھی پھر انجمن کا دفتر دیکھا اور شبیر احمد کاظمی سے ملا جو اب مشفق خواجہ کی جگہ جوائنٹ سیکرٹری ہیں۔ سیکرٹری جمیل الدین عالی ہیں اور صدر اخر حسین، انجمن پر کچھ عرصہ پہلے جمود سا طاری تھا مگر ادھر تین سال سے انھوں نے زندگی کا ثبوت دیا ہے اور نہایت قابلِ قدر کام کیا ہے۔ نظامی کی کدم راؤ پدم راؤ، قاموس الکتب، تیس ہزار الفاظ کی اُردو انگریزی لغت اور کئی تذکرے شائع کیے ہیں۔ لغتِ کبیر کی اشاعت بھی شروع ہوگئی ہے لیکن اُردو کالج جو مولوی عبدالحق نے قائم کیا تھا اپنی امتیازی شان برقرار نہ رکھ سکا۔ اب سب کالج حکومت نے لے لیے ہیں۔ مولوی عبدالحق کا کتب خانہ نیشنل میوزیم میں چلا گیا ہے۔ کراچی میں ایک سائنٹفک سوسائٹی ہے جس نے سائنسی مضامین پر اُردو میں کئی کتابیں تیار کرائی ہیں۔ اصطلاحوں کے سلسلے میں قدرتی طور پر عربی سے زیادہ مدد لی گئی ہے۔ مجھے جو استقبالیہ دیا گیا تھا اس میں مَیں نے اس بات پر زور دیا تھا کہ اصطلاحوں کے سلسلے میں خلق کو زیادہ ملحوظ رکھا جائے اور جس زبان کے الفاظ ہمارے صوتی نظام میں ڈھل سکتے ہوں انھیں مفہوم کے لحاظ سے بے تکلف لے لیا جائے۔ مجھے خوشی ہے کہ وہاں کے سائنس دانوں میں اس نکتے کا احساس زیادہ بڑھ رہا ہے۔

جمیل الدین عالی سے ایک دعوت میں ملاقات ہوئی تھی۔ پھر انھوں نے ہماری کی دعوت کی۔ ان کے یہاں بہت سے ادیبوں سے ملاقات ہوئی۔ عالی بڑے اچھے شاعر ہیں اور ان کے پڑھنے کا انداز بھی نہایت دلکش ہے۔ سیالکوٹ کا مشاعرہ تو گویا

انھوں نے لوٹ ہی لیا۔ احمد رضا قصوری صاحب اور ان کی بیگم سے بھی ملاقات ہوئی۔ بھٹو صاحب سابق وزیرِ اعظم پاکستان پر ان کے والد کو قتل کرانے کا الزام ہے۔ قصوری صاحب اندرا ملہوترہ کا بڑی محبت سے ذکر کرتے تھے، ان کی بیگم مُصر تھیں کہ میں اسلام آباد بھی آؤں۔ عالی صاحب نے جوش اور جگر کے بہت دلچسپ واقعات سُنائے۔ انہیں سے ابن انشا کی تشویشناک علالت کا علم ہوا۔ جنوری (۱۹۷۹ء) کے وسط میں ان کے مرنے کی خبر ملی اور اُردو دنیا ایک صاحبِ طرز شاعر اور ایک بانکے مزاح نگار اور صاحبِ طرز انشا پرداز سے محروم ہو گئی۔

۱۷

# آرزوئیں اور ارادے

rekhta

وسطِ مارچ (۱۹۷۶ء) میں (شملہ) جاؤں گا جہاں نومبر ۱۹۷۶ء تک قیام رہے گا اس وقت تک میری کتاب "انگریزی ادب کا اردو ادب پر اثر" مکمل ہو جائے گی۔ اس کے بعد علی گڑھ میں بیٹھ کر اپنے ادبی کام مکمل کروں گا۔ اقبال اور غالب پر کتابیں ادھوری پڑی ہیں انھیں مکمل کرنا ہے۔

دیوانِ غالب کا عرصہ ہوا انگریزی میں ترجمہ کیا تھا، اس پر نظرِ ثانی کر کے اسے چھپوانا ہے۔ اپنے متفرق مضامین، سفرنامے اور مجموعۂ کلام کو بھی شائع کرنا ہے، گزشتہ سال (۱۹۷۴ء) دسمبر سے اپنا ذاتی مکان بنوانا شروع کیا، آدھا بنا تھا کہ شملہ جانا پڑا۔ اب کے تعطیل (۱۹۷۵ء) میں اسے مکمل کرایا۔ اب سر پر چھت اور بیٹھنے کا ٹھکانہ تو ہو گیا۔ اپنی بے پروائی اور سادہ لوحی کی وجہ سے اب تک یہ ضروری کام نہ کر سکا تھا، چنانچہ خاصا اندوختہ اس کی نذر ہو گیا — اب تو صرف یہی آرزو ہے کہ چار پانچ برس اپنے ادبی کاموں کو مکمل کرنے کے لیے مل جائیں۔

---

لے مکتوبِ آل احمد سرور، علی گڑھ ۲۷۔ فروری ۱۹۷۶ء، بنام: ڈاکٹر سید معین الرحمٰن

میں[1] ۱۹۴۲ء میں لاہور گیا تھا، اس کے بعد (اب دسمبر ۱۹۷۷ء میں اقبال نیشنل کانگریس میں شرکت کا موقع ملا)۔ لاہور[2] کے قیام (دسمبر ۱۹۷۷ء، جنوری ۱۹۷۸ء کے بعد) یہاں (علی گڑھ) آکر کئی دن آرام کیا۔ اب اپنے کاموں کو نپٹانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ ادھر دو دانت کھوانے پڑے۔ اب نیچے کی بتیسی نئی بنے گی۔ پاکستان میں تماشا کا میاب آیا تمنا بے قرار آئی۔

مجھے[3] یہاں (علی گڑھ) آکر (جنوری ۱۹۷۸ء) دانت نکلوانے پڑے۔ ابھی تک (فروری ۱۹۷۸ء) غذا نارمل نہیں ہوئی ہے۔ چاول، دلیہ اور رقیق غذائیں کھا رہا ہوں۔ اس ہفتے میں (۹۔ فروری ۱۹۷۸ء تک) نئی بتیسی بن جائے گی، پھر زندگی معمول پر آجائے گی۔ دو دن کے لیے دہلی گیا تھا؛ پاکستان میں ایمرجنسی پاسپورٹ پر جانا ہوا تھا۔ میرا پاسپورٹ دہلی اور لکھنؤ کے درمیان نہ جانے کہاں غائب ہے؛ اس وجہ سے میں اب امریکہ نہیں جا سکتا، ویسے بھی سردی کی وجہ سے پس و پیش تھا، اب فروری (۱۹۷۸ء) کے آخر تک علی گڑھ میں ہوں۔ دہلی یونیورسٹی میں نظام خطبات دینے ہیں، وہ تیار کر رہا ہوں۔

میں[4] امریکہ نہ جا سکا، پاسپورٹ وقت پر نہ ملا، میں نے بھی دوڑ دھوپ نہ کی۔ پاکستان کی بات دوسری تھی، امریکہ جانا تو ہوتا ہی رہے گا۔ پاکستان میں جو پانچ ہفتے گزرے وہ حاصلِ زیست سمجھتا ہوں، اتنی محبت اور خلوص کا مظاہرہ ہوا کہ میں شرمندہ ہو گیا۔ ڈیڑھ مہینے (وسط جنوری سے فروری ۱۹۷۸ء تک) علی گڑھ میں رہا۔ یکم مارچ کو

---

[1] روزنامہ مشرق لاہور، ۱۷-اپریل ۱۹۷۹ء

[2] مکتوب علی گڑھ، جنوری ۱۹۷۸ء بنام: ڈاکٹر سید معین الرحمن

[3] مکتوب، علی گڑھ، ۲- فروری ۱۹۷۸ء بنام: ڈاکٹر سید معین الرحمن

[4] مکتوب، علی گڑھ، ۱۸- اپریل ۱۹۷۸ء بنام: ڈاکٹر سید معین الرحمن

سری نگر آگیا تھا، وسط مارچ (۱۹۷۸ء) میں پھر دہلی گیا۔ دہلی یونیورسٹی میں نظام خطبات دینے تھے، یہ اقبال پر تھے، لیکچر ان کو دے آیا ہوں، کہتے ہیں مئی تک چھاپ دیں گے عنوان ہے "اقبال کی شاعری — نظریہ اور عمل"

یہاں (سری نگر) مارچ میں خوب سردی اور بارش رہی، اپریل میں موسم معتدل ہوگیا تھا، مگر کل (۱۷-اپریل ۱۹۷۸ء) سے بارش کا سلسلہ ہے۔ آج کل یونیورسٹی کیمپس (کشمیر) کے چاروں طرف پہاڑوں پہ برف ہے۔ بادام، سیب، آڑو کے درختوں پر شگوفے ہیں۔ شالامار باغ میں پھول ہی پھول ہیں۔ سردی کے باوجود یہ موسم بڑا روح پرور ہے

مَیں اپنے کاموں میں لگا ہوا ہوں۔ اپنا ایک افتتاحیہ لیکچر اور "اقبال اور تصوف" پر سیمینار کی رُوداد، پریس بھیج رہا ہوں۔ جون (۱۹۷۸ء) میں "اقبال اور مغرب" پر ایک سیمینار کرنے کا ارادہ ہے..... بیگم کو ۲۴-مارچ (۱۹۷۸ء) کو یہاں لے آیا تھا۔

میں[1] اِدھر بیمار ہوگیا تھا۔ آخر اپریل (۱۹۷۸ء) میں ملیریا اور نمونیہ دونوں کا حملہ ہوا، ایک ہفتے ہسپتال میں رہا۔ ٹھیک ہو کر گھر، شروع مئی (۱۹۷۸ء) میں آگیا تھا، مگر کمزوری خاصی تھی، اب جاکر معمولات شروع کئے ہیں۔ بیوی بھی ادھر ہائی بلڈ پریشر کا شکار ہوگئی تھیں، اب بہتر ہیں۔

اِرادہ[2] ہے کہ جنوری یا فروری (۱۹۷۹ء) میں پھر لاہور کا پھیرا کروں، اب نومبر (۱۹۷۸ء) کے آخر تک سری نگر میں ہوں، پھر علی گڑھ جاؤں گا۔ مارچ (۱۹۷۹ء) کے شروع میں یہاں واپس آنا ہوگا — ادھر خاصی تعداد میں پاکستان سے کتابیں آگئیں۔ میرے دہلی یونیورسٹی سے نظام خطبات چھپ رہے ہیں، میں جولائی (۱۹۷۸ء) میں بیمار رہا، اب بالکل ٹھیک ہوں۔

---

[1] مکتوب، علی گڑھ ۱۹-مئی ۱۹۷۸ء، بنام ڈاکٹر سید معین الرحمٰن

[2] مکتوب، سری نگر ۲۰-اکتوبر ۱۹۷۸ء، بنام ڈاکٹر سید معین الرحمٰن

علی گڑھ[1] میں میرا قیام وسط مارچ (۱۹۷۹ء) تک تھا۔ میرا لڑکا جاوید جرمنی سے آیا ہوا تھا، اُس کی وجہ سے پندرہ دن وہاں ٹھہرنا پڑا، ورنہ یکم مارچ کو یونیورسٹی کھلنے پر مجھے یہاں (سری نگر) آجانا چاہیئے تھا۔ فی الحال تو پروگرام یہ رہتا ہے کہ میں شروع دسمبر میں علی گڑھ جاتا ہوں۔ یہاں وسط دسمبر سے آخر فروری تک جاڑے کی تعطیل ہوتی ہے۔ علی گڑھ میں بیچ میں ایک دو دن کے لیے پھیرا ہوتا ہے، ورنہ زیادہ تر قیام سری نگر میں رہتا ہے۔

در اصل ارادہ تو یہ تھا کہ یہاں (سری نگر) دو سال کی مدتِ ملازمت مئی ۱۹۷۹ء میں ختم ہونے کے بعد علی گڑھ چلا جاؤں گا، مگر شیخ عبداللہ صاحب نے میرے کہنے پر اقبال چیئر کو اقبال انسٹی ٹیوٹ میں تبدیل کر دیا اور ایک ریڈر اور ایک لیکچرر مدد کے لیے دے دیا، اِس لیے رُکنا پڑا۔

اب اس سال (۱۹۷۹ء) تو رہوں گا، اگلے سال دیکھا جائے گا۔ ویسے جی تو یہی چاہتا ہے کہ علی گڑھ میں جم کر بیٹھوں ــــــ ایک پروگرام تو اکتوبر یا نومبر (۱۹۷۹ء) میں آنکھ کا آپریشن کرانے کا ہے دس سال سے برابر موتیابند چل رہا ہے، اب کام پر اثر پڑنے لگا ہے، اس لیے ڈاکٹر آپریشن کرانے کو کہتی ہیں۔ یہ میری علی گڑھ کی مشہور ڈاکٹر حمیدہ سعید الظفر ہیں۔

دوسرا پروگرام یہ ہے کہ اس سے فارغ ہو کر پاکستان کا ایک پھیرا اور کروں گا۔ دسمبر کے آخر یا جنوری (۱۹۸۰ء) کے شروع میں ایک دفعہ اور آپ سب احباب سے اور کراچی کے رشتے داروں سے مل لوں، بیوی بھی ہمراہ ہوں گی، پاسپورٹ تو آ گیا ہے، ویزے کے لیے اب کوشش کروں گا۔ کچھ اقبال کے سلسلے میں معلومات بھی حاصل کرنی ہیں۔ جاوید اقبال اور نذیر نیازی سے خاص طور پر ملنا چاہتا ہوں، غالباً

---

[1] مکتوب، سری نگر ۱۸ اگست ۱۹۷۹ء، بنام: ڈاکٹر سید معین الرحمٰن

ایک ہفتے کا پروگرام ہوگا۔

میرے نظام خطبات: "اقبال کا نظریۂ شعر اور شاعری" دہلی یونیورسٹی نے چھاپ دیئے ہیں (ایک نسخہ علیحدہ روانہ کر رہا ہوں)۔ "اقبال اور تصوف" اور "اقبال اور مغرب" پر سمیناروں کی روداد مکتبہ جامعہ (دہلی) چھاپ رہا ہے۔ وہاں کاغذ کی فراہمی میں کچھ دقت کی وجہ سے کچھ دیر ہو گئی ہے۔

مجھے پاکستانی سفارت خانے (دہلی) کے پریس آفیسر نے لکھا کہ آپ کے لیے ایک میڈل جو اقبال کانگریس کے مندوبین کے لیے خاص طور سے تیار کرایا گیا ہے، رکھا ہے، آ کر لے لیجیے، اب دہلی جاؤں گا تو لے لوں گا۔ ان کی عنایت سے "ماہِ نو" دیکھنے کو مل جاتا ہے۔

میری بیوی کی صحت اب زیادہ اچھی نہیں رہتی۔ پاکستان وہ بھی میرے ساتھ آئیں گی ویزا غالباً لاہور اور کراچی کا ہی ملے گا۔ علی گڑھ میں مکان تو بنوالیا، مگر جم کر وہاں رہنا ابھی تک نہیں ہوا۔ میرا لڑکا جاوید، سترہ سال سے جرمنی میں ہے۔ تیسرے چوتھے سال پھیرا کر جاتا ہے، چاہتا ہوں وہ اب واپس آجائے مگر کوئی مناسب صورت نکلنے پر ہی آ سکتا ہے۔

ابھی میں نے ہندوستان کے مشہور مصور حسین سے اقبال کی تصویر بنوائی ہے۔ یہ اقبال لائبریری کے لیے ہے۔ میری کوشش سے (کشمیر یونیورسٹی لائبریری) اقبال لائبریری کے نام سے موسوم کی گئی ہے۔ اگلے مہینے اس کی نقاب کشائی ہوگی۔ آخر ستمبر (۱۹۷۹ء) میں اقبال کے فن پر ایک سمینار اور ہوگا، رفتہ رفتہ یہ سب چیزیں کتابی صورت میں آجائیں گی۔ خدا ان ارادوں کی تکمیل کرے۔

آج (۱۸۔اگست ۱۹۷۹ء) خوشونت سنگھ کا لیکچر ہے۔ انھوں نے "شکوہ" کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے، یہاں (سری نگر) سے عنقریب ایک ششماہی رسالہ "اقبالیات" بھی نکالنے کا ارادہ ہے، اس کا ایک شمارہ اردو میں ہوگا اور ایک انگریزی میں ہوگا — اب عمر کی وہ منزل ہے کہ کام پھیلانے کے بجائے سمیٹنا چاہتا ہوں، خدا اتنا موقع دے۔

# کتابیات

BIBLIOGRAPHY

زیرِ نظر "آپ بیتی" ورج ذیل ماخذ کی بنیاد پر مرتب ہوئی ہے :-

(الف) مستقل تصنیفات و مرتبات سرور :


۱۔ تنقیدی اشارے ، پہلا پاکستانی ایڈیشن ، کراچی ۱۹۶۳ء

۲۔ نئے اور پرانے چراغ ، طبع سوم ، لکھنؤ ، ۱۹۵۵ء

۳۔ تنقید کیا ہے ، طبع سوم ، دہلی ، ستمبر ۱۹۵۵ء

۴۔ ادب اور نظریہ ، طبع اوّل ، لکھنؤ ، ۱۹۵۴ء

۵۔ ذوقِ جنوں ، طبع اوّل ، لکھنؤ ، نومبر ۱۹۵۵ء

۶۔ نظر اور نظریے ، طبع اوّل ، دہلی ، اگست ۱۹۷۳ء

۷۔ مسرت سے بصیرت تک ، طبع اوّل ، دہلی ۱۹۷۴ء

۸۔ عرفانِ غالب ، طبع اوّل ، علی گڑھ ، ستمبر ۱۹۷۳ء

۹۔ عرفانِ اقبال ( مرتبہ : زہرا معین ) ، طبع اوّل ، لاہور ۱۹۷۷ء

۱۰۔ انتخابِ جدید ، طبع پنجم ، کراچی ۱۹۷۳ء


(ب) دیگر مصادر :


۱۔ شخصیات اور واقعات (جنہوں نے مجھے متاثر کیا) ، مرتبہ : جنید احمد
طبع اوّل ، بمبئی ۱۹۵۸ء

۲- انگریزی ادب کی تاریخ، ڈاکٹر محمد حسین، علی گڑھ، مارچ ۱۹۷۰ء
۳- ادبِ لطیف، لاہور (مدیر: انتظار حسین)، جنوری ۱۹۶۴ء
۴- نقوش، لاہور (مدیر: محمد طفیل)، خطوط نمبر ۳، اپریل، مئی ۱۹۶۸ء
۵- آج کل، (مدیر: شہباز حسین) دہلی، جون ۱۹۶۹ء
۶- روزنامہ مشرق، لاہور، ۱۱- دسمبر ۱۹۷۷ء
۷- روزنامہ مشرق، لاہور، ۱۷- اپریل ۱۹۷۹ء
۸- روزنامہ مشرق، لاہور، ۲۴- اپریل ۱۹۷۹ء
۹- روزنامہ مشرق، لاہور، ۸- مئی ۱۹۷۹ء
۱۰- روزنامہ مشرق، لاہور، ۱۵- مئی ۱۹۷۹ء
۱۱- روزنامہ مشرق، لاہور، ۲۲- مئی ۱۹۷۹ء
۱۲- روزنامہ حریت، کراچی، ۶- جون ۱۹۸۰ء
۱۳- سرور صاحب کے خطوط بنام: ڈاکٹر سید معین الرحمٰن ۱۹۷۵ء، ۱۹۷۶ء، ۱۹۷۸ء، ۱۹۷۹ء

○

4627

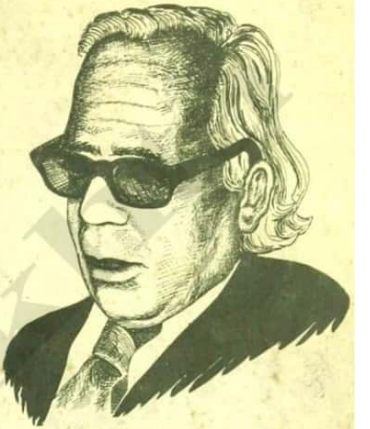

سُرور صاحب کے نزدیک شخصیت کا حُسن ذہانت کی چمک دَمک میں نہیں، کردار کی استواری اور مضبوطی میں ہے جو زندہ اور توانا خیالات سے آتی ہے ـــــ سُرور صاحب کی شخصیت کے حُسن تک پہنچ پانے اور اسے گرفت میں لانے کے لیے میں نے یہی راستہ اختیار کیا ہے، یعنی نظر زیادہ تر اُن کے "خیالات" پر رہی ہے محض "حالات" پر نہیں!

ـــــ زہرا معین